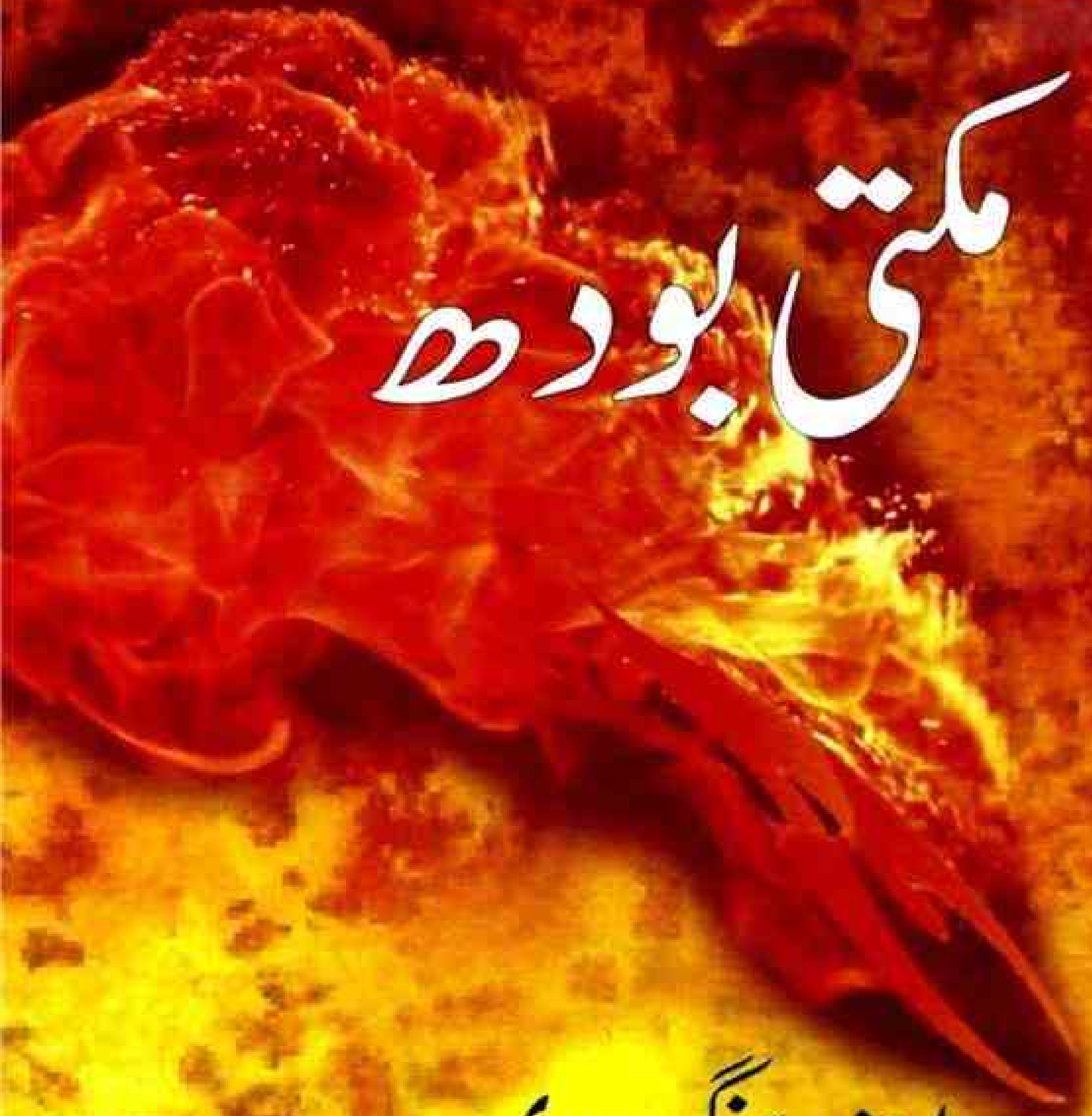
مکتی بودھ



راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

مکتی بودھ

مکتی بودھ

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Mukti Bodh
by
Rajinder Singh Bedi
Rs.65/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/65 روپے
ISBN: 978-81-7587-672-9 سلسلۂ مطبوعات: 1555

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی ۔ 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرنظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آیندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

مینیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست

افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل

میں معافی چاہوں گا کہ اس مضمون کو کھولنے کے لیے مجھے اپنی ذات میں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اس لیے بھی در گزر کریں گے کہ اتنی بڑی مخلوق کی میں بھی اکائی ہوں ایک، اس لیے سب کو سمجھنے کے لیے میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنے آپ کو سمجھ لوں۔

افسانوی تجربہ کیا ہے؟ مجھے افسانہ سازی کی لت کیسے پڑی؟ اگر یہ مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پڑی، تو باقی دوسروں کو کیوں نہیں پڑی؟ کیوں نہیں میں کسی فرنانڈس کی طرح گرجے کے سامنے بیٹھا موم بتیاں بیچتا؟

فن کسی شخص میں سوتے کی طرح سے نہیں پھوٹ نکلتا۔ ایسا نہیں کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فن کار ہو کر جاگیں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں آدمی پیدائشی طور پر فن کار ہے، لیکن یہ ضرور

کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صلاحتیں ہیں، جن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چاہے وہ اسے جبلت میں ملیں اور یا وہ ریاضت سے اُن کا اکتساب کرے۔ پہلی صلاحیت تو یہ کہ وہ ہر بات کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو، جس کے لیے ایک طرف تو وہ داد وتحسین پائے اور دوسری طرف ایسے دُکھ اٹھائے جیسے کہ اُس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اسے نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہو۔ دوسری صلاحیت یہ کہ اس کے کام و دہن اُس چرند کی طرح سے ہوں جو مُنہ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آئے کہ گھا سلیٹ یا بجلی کا زیادہ خرچ ہو گیا، یا کاغذ کے ریم کے ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ قدرت کے کسی بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقشِ ثانی کو ہمیشہ نقشِ اول پر ترجیح دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پہ کان دے۔ مثلاً موسیقی، اور جان پائے کہ استاد آج کیوں سُر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل گیا ہے۔ مصوری کے لیے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ دِشتی واشتی میں خطوط کیسی رعنائی اور توانائی سے اُبھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس اِڈیٹر نے اس کا افسانہ واپس کر دیا ہے، نااہل ہے!

اس کے بعد کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ (TRIGGER OFF) سکتی ہے مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اُچھال دے یا کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے، جس پہ اس غریب کا کوئی بس نہ ہو

اور جو اسے بے سلامتی کا شکار کر دے اور وہ اپنے دل میں ٹھان لے کہ مجھے اس بے تعاون، بے رحم دنیا میں کہیں جگہ پانا ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا اس میں مدافعت کی وہ قوتیں نہیں اُبھرتیں، قدرت کے پاس جن کا بہت بڑا خزانہ ہے۔

نوعمری میں یہ سب باتیں میرے ساتھ ہوئیں اور مجھے یقین ہے کہ تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ دوسرے فن کاروں پر بھی بیتی ہوں گی۔ اکثر لوگوں کو حادثے پیش آتے ہیں اور وہ گوناگوں مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں، لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ وہ فن کے راستے سے گزرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ لیے۔ صدرہر جا کہ نشیند، صدر است۔ انھوں نے یا تو اپنے مخصوص کام میں جھنڈے گاڑے اور یا تھک ہار کر جنت کو سدھارے۔ گویا بے عزتی اور پے در پے حادثوں کے بعد کچھ کر کے، بن کر دکھانے کے سلسلے میں اپنے ملک کے ہزاروں اردوداں نوجوان کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کیوں کہ چھوٹی عمر ہی میں میری شادی ہو گئی تھی . . . آپ میری بات سمجھیے۔ کوئی معشوق میرے سامنے تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو مجھے بچہ سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اگر وہ رُکے تو میری بیوی جوتا پکڑ کر اسے ہنکال دیتی تھی۔ میں نے تو یہ پڑھ رکھا تھا کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے میں چپکے سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور کرتا ہی رہ گیا۔ میں نے ہجر و وصال، وفا و بے وفائی، رقیب و محتسب کے مضمون شاعروں کے تتبع میں

باندھے، مگر وہ سب مجھے جھوٹے اور کھوکھلے لگتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ محتسب تو میں خود ہوں۔ رقیبِ روسیاہ کی کیا مجال جو فرسنگ بھی میرے گھر کے پاس پھٹکے۔ یہ تو شادی کے ان لکھے معاہدے کی دوسری مد ہے، جس کی رو سے اگر رقیب کو قتل نہیں کیا جاسکتا، حوالات تو بھجوایا جا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو فیض کی طرح رقیب کے ساتھ رشتہ پیدا کر سکتے ہیں اور اس کے افادی پہلو سے واقف ہیں۔ گویا زندگی جو بھی تعلیم مروّجہ شعر کے سلسلے میں دیتی تھی، میں اس میں کورا ہی رہا۔ اس کے برعکس میڈم زندگی نے تلافیِ مافات میں مجھے دوسرے مسئلے دے دیے۔ مثلاً خانہ داری کے مسئلے، روزگار کے مسئلے جو کسی طرح بھی عشق کے مسائل سے کم نہ تھے۔ حالات نے ایسا جمود پیدا کر دیا اور بدن میں ایسی کپکپی کہ لاہور کے لنڈے بازار سے خریدا ہوا، مرانجام انجام اینڈ کو کا پرانا، پھٹا ہوا گرم کوٹ بھی مجھے نہ بچا سکا۔

بس، بہت ہو لی۔ اب میں اپنی بات بند کرتا ہوں، کیونکہ گرم کوٹ کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، یہ کچھ لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ کیا نہیں ہوا کے بارے میں انھیں مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔ افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں ہے، تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن، شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔ پھر شعر، فی الخصوص غزل میں آپ عورت سے مخاطب ہیں، لیکن افسانے

میں کوئی ایسی قباحت نہیں۔ آپ مرد سے بات کر رہے ہیں، اس لیے زبان کا اتنا رکھ رکھاو نہیں۔ غزل کا شعر کسی کھردرے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نژاد ہونے کی وجہ سے اس میں کھردراپن ہونا ہی چاہیے، جس سے وہ شعر سے ممیز ہو سکے۔ دنیا میں حسین عورت کے لیے جگہ ہے تو اکھڑ مرد کے لیے بھی ہے، جو اپنے اکھڑپنا ہی کی وجہ سے صنفِ نازک کو مرغوب ہے۔ فیصلہ اگرچہ عورت پہ نہیں، مگر وہ بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو نقل میں بھی اس کی چال چلے۔ ہمارے نقادوں نے افسانے کو داد بھی دی تو نظم کے راستے سے ہو کر، نثر کی راہ سے نہیں، جس سے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کی ریل پٹری سے اُتر گئی اور جو نہیں اُتری تھی تو ایسی توصیف سے متاثر ہو کر انھوں نے خود، اپنے ہاتھوں سے اپنی لائن کے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لیے۔

یہ طے بات ہے کہ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ آخر اتنی لمبی اور مسلسل بحر سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں تو چاہییں ہی۔ باقی اصنافِ ادب، جن میں ناول بھی شامل ہے، اُن کی طرف جزواً جزواً توجہ دی جا سکتی ہے، لیکن افسانے میں جزو و کل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہراول، متداول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں تو یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ شروع سے لے کر آخر تک لکھ لینے کے بعد پھر آپ ایک لفظ بڑھانے یا دو فقرے کاٹ دینے ہی کے لیے لوٹ سکتے ہیں۔ ایزاد و اضافے کی یہ نسبت میں نے

بے خیالی میں قائم نہیں کی، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ افسانے میں ایزاد اضافے سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ کو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہوگا، جو بجائے خود خوبصورت ہوں اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں اور یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں۔

اب میں ایک چونکا دینے والی بات کرنے جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اُردو زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ افسانے کے سے فنِ لطیف کو اس طریقے سے سمجھ سکے یا قبول کر سکے، جیسے سمجھنا یا قبول کرنا چاہیے۔ میری اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ پیچھے مڑ کر دیکھیے کہ ہر آن آپ نے ڈکشن پہ کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے۔ اس عمل کا گراف بنایا جائے تو وہ میرؔ، انیسؔ اور غالبؔ کے بعد داغؔ تک نیچے ہی آتا ہوا دکھائی دے گا۔ معلوم ہوتا ہے، ہم نے 'فسانۂ آزاد' کو افسانہ یا ناول ہی سمجھ کر پڑھا۔ ہم نے اس کا مقابلہ ——— (VANITY FAIR) سے کیا ہے۔ ہم نے آغا حشر کو ہندستانی شیکسپیر بھی کہا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے دونوں میں سے کسی ایک کو نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو فرق کو نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونا فلم اور ٹیلی وژن انسٹی ٹیوٹ میں ممتحن کی حیثیت سے جب میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا — آپ کو کون سے مصنف پسند ہیں تو اُس نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا "مجھے تو دو ہی مصنف پسند ہیں سر! گلشن نندہ اور شیکسپیر!"

کبھی ہمایوں اور ادبی دنیا، دونوں رسالے فیاض محمود اور عاشق بٹالوی کی توصیف میں کالے تھے۔ اور آج ہم ہی افسانے کی تاریخ میں ان

بے چاروں کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ہم نے افسانے میں زورِ بیان کو اس قدر سراہا ہے کہ ادب تو ایک طرف، خود ادیب کو نقصان پہنچایا ہے۔ افسانے میں اظہار کے تخلیقی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ گریز کا ہے۔ لیکن ہمارے شغب آشنا کان گریز کو عجزِ بیان کا نام دیتے ہیں۔ ہم ابھی تک داستان گوئی، فلسفہ رانی اور تاریخی واقعات کو آج یا کل کے کرداروں کی معرفت پیش کر دیے جانے پر سر دُھنتے ہیں۔ سر دُھننے سے مجھے کچھ وہ نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ تو ہم کچھ بھی کر کے دُھنیں گے ہی کہ وہ ہماری عادتِ ثانیہ ہو چکی ہے۔ مگر تکلیف اس وقت ہوتی ہے، جب ہم خطیب، مورّخ اور فلسفہ بردار کو ہی افسانہ نگار کا نام دیتے ہیں۔

افسانہ کوئی سودیشی (INDIGENOUS) شے نہیں۔ ہم نے جاتک کہانیاں لکھیں۔ کتھا سرت ساگر لکھی اور ہم سے لوگ انھیں مغرب لے گئے۔ جہاں انھوں نے کہانی کو فن بنا دیا۔ ہیئت میں بے شمار تجربے کیے، جن سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے۔ افسانے کے فن کو چھوڑیے، کسی بھی فن کو جانچنے پرکھنے کے لیے عالمی پیمانے پر اسے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی علاحدگی (ISOLATION) نہیں ہے۔ ملکوں اور قوموں کی حدیں نہیں ہیں۔ بہ شرطے کہ آپ منٹو کو موپساں اور مجھے چیخوف کے نام سے نہ پکارنے لگیں۔ حالانکہ یہ ممکن ہے میں خود کو کاوا باتا کہلوانا پسند کروں۔ آپ کو کیسا لگے گا اگر میں کہوں کہ رام لال اور جوگندر پال ہندستان کے ہینرش بوہل ہیں اور قرۃ العین حیدر، ہان سویان؟

مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے، بہ شرطے کہ ہان سویان کے ہم وطن اُسے اپنے دیس کی قرۃ العین حیدر کہیں۔

عجیب دھاندلی ہے نا۔ معلوم ہوتا ہے اردو اسم بامسمّا ہوتی جارہی ہے۔ ہینرشش بوہل کا ایک کردار جورج ہے کہتا ہے:

"۔۔۔ ایسے مقدمے میں انصاف قسم کی کوئی چیز ہی نہیں، کیوں کہ ملزم اس کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی آمریت ہے، جس میں انفرادی اظہار اور خلاقی سہوِ زمانی (ANACHRONISTIC) بات ہے۔۔"

مذکورہ ریاضت اور عالمی پیمانے پہ گرد و پیش کی آگہی کے بعد ہی افسانے پر عبور حاصل ہوتا ہے اور جب یہ بات ہوجاتی ہے تو افسانہ لکھنے والے کے اضطرار (REFLEXFS) کا حصہ ہوجاتا ہے۔ نہ صرف آپ کی بے ارادہ بات سے افسانے کا مواد مل سکتا ہے، بلکہ ہر موڑ، ہر نکڑ پہ افسانے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ انھیں سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار کے ہاتھ قلم ہو جائیں۔ بہ ہر حال افسانوی تجربے پر عبور حاصل ہو جانے کے بعد افسانہ نگار کو یونان کے اساطیری کردار می ڈاس کا وہ لمس مل جاتا ہے، جس سے ہر بات سونا ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندستان کا افسانہ نگار سونے کو بھی چھوتا ہے تو وہ افسانہ ہو جاتا ہے۔

گھبراہٹ کی بات اس لیے نہیں کہ اتنا سونا پاکر می ڈاس بھی بھوکا مرا تھا۔

افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا دونوں عمل

ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ۔ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ کیوں کہ انھیں بھول نہ سکنے کی بیماری ہے۔ میں ایک دماغی تساہل کی طرف اشارہ کرتا ہوں، جسے منٹو نے میرے نام ایک خط میں لکھا۔ "بیدی! تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔" میں سمجھ گیا کہ منٹو کا مطلب ہے۔ میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ مگر میں کیا کرتا؛ ایک طرف مجھے فن اور دوسری طرف زبان سے لوہا لینا تھا۔ اہل زبان اس قدر بے مروّت نکلے کہ انھوں نے اقبال کا بھی لحاظ نہ کیا۔ کسی سے پوچھا آپ اقبالؔ سے ملے تو کیا بات ہوئی۔ بولے، کچھ نہیں میں 'جی ہاں، جی ہاں،' کہتا رہا اور وہ 'ہاں جی، ہاں جی' کہتے رہے۔ اب حالات میں نسبتاً آسانی ہے کیوں کہ سند کے لیے ہمیں کہیں دور نہیں جانا ہے۔ پرسوں ہی ڈاکٹر نارنگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں ایک تحریک چلی ہے جو شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی پوُرب سے آئی ہوئی زبان کو ٹکسالی نہیں مانتی۔ بہرحال میں نے منٹو کی تنقید سے فائدہ اٹھایا اور دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا لیکن اس کا کیا کروں کہ وہ اِدھر اُدھر سے ہو کر پھر رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بے ادائی کی ادا جس کی طرف منٹو نے اشارہ کیا میرؔ کے الفاظ میں خاک ہی میں مل کر میسّر آتی ہے۔ لیکن یہی بے ادائی اور قلم برداشتگی جہاں منٹو اور کرشن چندر میں مزا پیدا کرتی تھی،

وہیں بدمزگی بھی۔ منٹو کی تنقید کی وجہ سے میری حالت عورت کی سی تھی جو مقبوض اور تاراج بھی ہونا چاہتی ہے اور پھر اس کا بدلہ لینا بھی۔ جب میں نے منٹو کے کچھ افسانوں میں لاابالی پن دیکھا تو انھیں لکھا — منٹو، تم میں ایک بڑی بات ہے اور وہ یہ کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔

اس کے بعد منٹو اور مجھ میں خط و کتابت بند ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ انھوں نے میری تنقید کا اتنا برا نہیں مانا، جتنا اس بات کا کہ میں لکھوں گا خاک، جب کہ شادی سے پرے مجھے کسی بات کا تجربہ ہی نہیں۔ اس پہ طرفہ، میں نہ صرف بھینس کا دودھ پیتا ہوں بلکہ اسے پال بھی رکھا ہے۔ میں انھیں کیسے بتاتا کہ اگراونٹ کا رشتہ مسلمان سے ہے، گائے کا ہندو سے، تو سکھ کا بھی کسی سے ہو سکتا ہے۔

افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا — اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے۔ کچھ وافر باتیں سوءِ ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آجاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فتور سے۔ تسکین کی بات صرف اتنی ہے کہ افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر اڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا۔ ہم اس میں ایزادو اضافہ کر سکتے ہیں اور اس پر بات نہ بنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ اگر ہیمنگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے، تو ہم ایسا

کیوں نہیں کر سکتے؟

اُردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگر اُن کی تعداد گنی چنی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورے کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ہم اپنے ہی امیج کے قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔

(یہ مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جدید اُردو ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کے مسائل پر منعقدہ سیمینار میں خطبۂ صدارت کے طور پر پڑھا گیا۔)

مکتی بودھ

یقین مانیے، اس میں نند لال کا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ وہ کیا کرتا — ؟ اس کی فلم 'امبکا' چل گئی تھی۔

میں بھی حد ہوں جو ہندی فلم کے سلسلے میں منطق کی بات کرنے جا رہا ہوں! اس پر میں کہوں گا کہ جس منطق سے ہندی فلم فیل ہوتی ہے، اسی سے چل بھی جاتی ہے۔ جیسے اسے کوئی ضد ہو جاتی ہے، چلنے یا نہ چلنے کی۔ ایسی ہی ضد میں نند لال کی پہلی دو فلمیں پٹ گئی تھیں، حالانکہ ان میں سے ایک میں ہیروئن اسٹوڈیو کی برسات میں بھیگی بھی تھی، کپڑے اس کے بدن کے ساتھ چپکے بھی تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کپڑے ایکا ایکی کہیں نیچے چلے گئے ہیں اور بدن چھٹپٹا کے اوپر آ گیا ہے۔ بھیگنے سے پہلے کتنی مفلس اور نادار سی معلوم ہوتی تھی لیکن جب کیا مال دار نظر آ رہی تھی وہ۔ دوسری فلم میں ہیرو نے خالی ہاتھوں، گلدانوں، صوفے کی ٹانگوں، لیمپ شیڈ

شنزیلیر کی زنجیروں اور جانے کن کن ہتھیاروں سے کاڈبوائے ولین اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کو فراش کر دیا تھا۔ کیسے وہ الٹے شاٹ میں اچھل کر میزنین فلور پر پہنچ جاتا تھا، جہاں ایک رستہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ ہوتا ہے، جس پر وہ جھولتا ہوا پھر نیچے کے دوزخ میں کود جاتا ہے۔ جبھی وِرودھی دَل میں سے کسی نے آناً فاناً اٹھ کر پانگے سے ہیرو کا سر کاٹ دیا — جی، بالکل ہی کاٹ دیا۔ یعنی سر الگ اور دھڑ الگ۔ لوگ ہراساں ہو گئے۔ اب کیا ہوگا؟ ارے یہ تو بالکل ہی مر گیا! وہ جانتے تھے کہ فلم کا ہیرو مر ہی نہیں سکتا اور پھر ہراساں بھی ہونا چاہتے تھے۔ ہیروئن کو شادی کیے بنا ہی وِدھوا کر گیا تو اس سنسار کا کیا ہوگا؟ سرشٹی کیسے چلے گی؟ مگر مانیے تو... کہاں مرا وہ؟ جبھی دیکھنے میں کنکریٹ کی دیوار سے دیوی پرکٹ ہو گئی اور نریتہ کے سب نیموں کا پالن کرتے ہوئے ہیرو کے پاس چلی آئی۔ اس کے کٹے ہوئے سر کو مُدرا میں اُٹھایا۔ ایسے دھیرج سے کہ اُسے درد نہ ہو اور پھر اسے دھڑ کے ساتھ لگا دیا۔ سر لگتے ہی ہیرو نے پہلے ایک چھینک ماری، پھر اُٹھا اور ہری بول، کہتا ہوا ایک طرف یوں چل دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ کوئی دعا نہ سلام، شکریہ نہ ڈنڈوت۔ لیکن جب ہال میں کیا تالیاں پٹی تھیں۔ اگر فلم کے آخر میں لوگوں نے نند لال کو پیٹ ڈالا تو اس کی وجہ اسکرین پلے کی غلطی تھی... بات یوں ہوئی کہ دیوی کے ہاتھوں سے تو وہ بچ گیا، لیکن کچھ دیر بعد باہر جا کر سمندر میں ڈوب گیا!

جب نند لال کوئی بی۔ اے فیل نہ تھا، جیسے اب داُمبکا،

کے بعد وہ پاس نہیں۔ وہ تو وہی تھا۔ فنانسر بردکر، جو اپنی حاجتوں کے پیشِ نظر، روپیا لوٹا دیے جانے پر بھی ہُنڈی واپس نہ کرتا۔ کہیں سال ایک کے بعد اسے پھر اپنی بھلکڑ اسامی کے سامنے پیش کر دیتا۔ مگر، ایک بات ہے۔ نند لال جب بھی پہلے خود ہر کسی کو نمسکار کرتا تھا جیسے آج بھی کرتا ہے۔ ورنہ فلموں میں یہ خلاف وضع فطری بات ہے۔ یہاں تو جو آپ کے سلام کا جواب نہ دے، سمجھو اس کی فلم چل گئی اور اگر آپ سے پہلے وِش کرے تو گھوٹالا ہوا۔

نند لال کی شکل میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ہماری آپ کی طرح کا آدمی تھا وہ۔ عام ہندستانی قد، وہی رنگ رُوپ، وہی چیچک کے داغ جو بچپن میں بہت نمایاں ہوتے ہیں، لیکن جوانی میں طاقت پکڑنے میں اپنی ہی ایک داب، ایک چھاپ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں عضلات کی سُکڑن چھوڑ جاتے ہیں، البتہ جس میں آدمی بات کرنے میں سر کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیتا ہے، آپ اس سے اُدھار لینے جائیں تو آخر دم تک یہی لگتا ہے وہ دے گا، نہیں دے گا، دے گا، نہیں دے گا۔ ۔ ۔

گونچھا سے گدیوں تک آپ ہندستانی سنوں کو جمع کریں اور ان کی تعداد سے حاصل جمع کو تقسیم کریں تو جو اوسط نکلتا ہے، وہ نند لال کی شکل ہے۔ نہیں، ایسے شاید میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں گا۔ آپ یہاں سے ایرانی ہوٹل کوُلار کی طرف چلیں تو راستے میں دو نکڑ پڑتے ہیں۔ ان پر لڑنے والے ہر تیسرے اللّٰہ ٹپ آدمی کی شکل نند لال کی سی ہو گی۔ اب سمجھے نا آپ؟ — ٹھیک ہے کرشن کنھیا

کا ایک نام نند لال بھی ہے، مگر کرشن کہاں کے گورے چٹے تھے؟ وہ بھی تو بھارت ورش میں اُتّر اور دکن کے میل کی ایک ناکام سی کوشش تھے۔

نند لال کو اپنے نام کے عامیانہ ہونے سے بہت چڑ تھی۔ مگر وہ کیا کرتا؟ نام بھی تو وجود کی طرح آدمی کے ساتھ یوں چپک جاتا ہے کہ ایک ہی بار اترتا ہے۔ وہ چڑ دراصل پیدا کی گئی تھی۔ ایسی حرکتیں بالعموم عورتیں کرتی ہیں، اپنے وجود کو بھول کر — فلمی لڑکیاں اسے کہتیں — کیا جہا بھارت کے زمانے کا نام رکھ دیا تمھارے ماں باپ نے۔ اب اشونی کمار کو دیکھو۔ ہم اسے پیار سے اشو اشو تو پکار سکتی ہیں۔ نندو کیا اچھا لگتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے جیسے ٹھینگا ہے۔ چنانچہ نند لال نے باقاعدہ اور قانونی طور پر اپنا نام دیویندر کمار رکھ لیا، اس امید میں کہ ریحانہ اور جے شری اسے دیو دیو کہہ کر پکاریں گی تو کتنا اچھا لگے گا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک پارٹی بھی کی جس میں اسکاچ چلی، کباب کارنر سے افغانی کباب اور تکّے بھی آئے۔ پانچ ساڑھے پانچ ہزار کا خرچ بھی ہوا، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ ہر دوسرے تیسرے اسے کوئی مل جاتا اور کہتا — ارے نند لال، سنا ہے تو نے اپنا نام بدل لیا ہے؟ ایک دن رینو آئی جو پارٹی کے دن آؤٹ ڈور کر رہی تھی۔ بولی — اتنی بڑی پارٹی کر دی، نند لال جی اور ہمیں پوچھا ہی نہیں۔ بیوی کہتی — میں نے تو اسی سے شادی کی تھی، میں کوئی دوسرا نہیں جانتی۔ کوئی میم تھوڑے ہوں میں جو آج ایک کے ساتھ ہو اور کل دوسرے کے ساتھ۔ میرا

تو وہی ہے ــــ اور پھر پاس بیٹھی ہوئی عورت نام لے دیتی ـ نند لال ــــ اردل مانگنے کے لیے ایکسٹرا لوگ دفتر میں آتے ہی تھے، چنانچہ اُس دن بھی دیویندر کمار ایسر کا نام پڑھ کر ایک چلا آیا ـ باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے کہا ـ ہاں، صاحب اندر ہیں ـ ایکسٹرا اندر جاتے ہی انھیں پانو پر واپس چلا آیا ــ وہاں تو کوئی نہیں، وہی نند لال بیٹھا ہے!

نند لال کا مکان معمولی تھا اور بیوی بھی معمولی، مگر کچھ نو دولتوں کی باتیں چلی آئی تھیں اُس میں اِمبکا کے جانے کے بعد ـ اس نے نئی کار خریدی، لیکن اسے بیوی کی اردل میں دے دیا اور خود اسی کھٹارے میں کھچ کھچ کرتا رہا، کیونکہ وہ لکی تھا ـ سپیئر جوتوں کی طرح سے رہنے پر بھی نند لال بڑا مکان لینے سے ڈرتا تھا ـ اس لیے نہیں کہ کل کلاں شاید اسی میں لوٹنا پڑے بلکہ اس لیے کہ اس کے بھاگیہ اُودے ہونے کی شری گنیش اسی لاطور بھون میں کے دو کمروں اور بالکونی سے ہوئی تھی ـ چنانچہ اسی کی دیواروں پر اس نے سخت چمکیلے، بھڑکیلے، چکو مارواڑی رنگ پوت لیے تھے ـ فریج، ٹیلی وژن تو آج ہرا ننت رام، بے انت سنگھ کے پاس ہوتے ہیں، اس لیے کہیں تو امتیازی شان پانے کی پھڑپھڑاہٹ اور بیوی کو خوش کرنے کی لالسا میں اس نے اپنے ڈبل بیڈ کے پائے چاندی سے مڑھوا لیے اور بیوی بار بار پہلو بدل کر اپنے پتی کی بے خوابی کا ساتھ دینے لگی ـ سب کچھ کتنا فراواں اور کم کم معلوم ہوتا تھا ـ ایک وہ وقت تھا جب فرش بھی عرش تھا ان کے لیے اور ایک یہ جس میں عرش بھی سر پیٹ کر

رہ گیا تھا۔ بہرحال نند لال کو جو بھی کرنا تھا، ابھی دو کمروں میں اور جو نہیں کرنا تھا وہ بھی انھی میں۔

نند لال کے اِردگرد کی سب چیزیں عامیانہ بلکہ سوقیانہ ہونے کے باوجود ایک چیز بڑی اچھی تھی، جو پدربلے جنم کے کسی پھل میں چلی آئی تھی، اور وہ تھی مورننگ گلوری کی بیل جو کیسی بے خودی سے اس کے گھر کی دیواروں پر پھیلی تھی۔ اس میں اسکارلٹ اودا ہارا کے پھول پھوٹ کر ہر آتے جاتے کے اندر لال بخار پیدا کرتے تھے۔ لوگ عام طور سے یہی سمجھتے تھے کہ اس گھر کے باسی کتنے تازہ ہیں، کتنے خوش مذاق ہیں۔ پھر ان کے جلدے میں ریاض کرتی ہوئی کسی لڑکی کی آواز مل جاتی۔

پنگھٹ پہ نند لال مجھے چھیڑ گیو رے

اور سدھا، نند لال کی بیوی اُٹھ کر سب کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیتی۔

فلمی اشتراکیت میں کوئی اکیلا نہیں کھاتا — کھا بھی نہیں سکتا۔ کسی کے اُبکائے جاتے ہی سب کے کان ہو جاتے ہیں اور وہ گنگوٹک کی جونکوں کی طرح سے کچھ یوں چمٹتے ہیں کہ آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا۔ ادھر آدمی گرتا ہے، ادھر جونکیں گر جاتی ہیں — نند لال کا سا اصیل آدمی یہی کہتا ہوا پایا جاتا ہے — اچھا، تم میرے تاؤ کے ممیرے بیٹے ہو، اچھا؟ ہاں، ہاں، سنا تھا تمھارے بارے میں کیا کروں یار، جب سے اُبکائی چلی ہے، میرا فیوز ہی اُڑ گیا ہے۔ بس، دیوی ماں کی مہربانی ہے — کیا پیو گے؟ اور وہ ممیرا بھائی پینے کی بجائے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور ہمیشہ کھاتا رہتا ہے۔

رات بیوی جب میاں کے ساتھ بھینچ کر لیٹتی ہے تو کہتی ہے —

ہائے جی! تمھارے پتا کا تو بڑا بھائی تھا ہی نہیں کوئی ۔

ایں؟ نندلال کہتا ہے ۔ ان کا کوئی دوست ہوگا۔ سوجاؤ، سرمت کھاؤ میرا۔

ہیرالال پانچواں ورن ہے جو آد سے چلا آیا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ منو مہاراج کی گنتی میں کیوں نہیں آیا؟ پیڑ الگ، پتے الگ تو دیمک اور ارض بھی الگ ہوتے ہیں۔

اور آج تو اس پانچویں ورن کے بنا وافر پیسے اور اُمبکا کا کوئی حل ہی نہیں ۔

جتنا آپ اس کاسہ لیس نسل کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے، اتنی ہی اس میں لچک، اتنا ہی چونچال پن اور مقاومت پیدا ہو جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد کاکروچ اور چوہے زہر کی گولیاں ہضم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آج کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسے خوشامد پسند نہیں۔ نہیں وہ خدا سے بھی بڑا ہوگیا۔ پھر آپ اگر پہلو بدلتے ہیں تو یہ ورن بھی نیا پینترا پیش کرنا جانتا ہے۔ آج کا طفیلیا کبھی بھی سیدھے سیدھے مرد کو عقل مند اور عورت کو خوبصورت نہیں کہتا۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے ۔ ناک کیسی بھی ہے، مگر تمھارے چہرے پر پھبتی ہے بھابی ۔ خوبصورتی کا یہی مطلب نہیں کہ رنگ گورا ہو۔ آج کل تو۔

رنڈسالا ۔ سارا دن اپنی زبان اور سامنے والے کے کان کی مالش کرتا رہتا ہے۔ یہ جو آدمی شُدھا اور نندلال کے پاس آیا تھا، اس کا نام ہیرا تھا۔ شاید لال بھی ہو ۔ ہیرالال۔ نامر، جوشی، پانڈے، رام نواس کے طریقے الگ تھے اور ہیرالال کے الگ۔ وہ

فلموں میں پلے بیک سنگر ہونے آیا تھا۔ ہیرا آج کے زمانے کا آدمی تھا۔ اس کی شکل ماڈ تھی اور عقل بھی ماڈ۔ اس کے بال بے طرح لمبے تھے اور گھنے، گھناؤنے۔ انسان کے ہونے کے بجائے وہ کسی گھوڑے کے معلوم ہوتے تھے مگر برل کریم کی کرشمہ سازی سے اطاعت پذیر ہوکر وہ کنڈل اور کڑیاں بن کر کاندھے اور گلے میں لٹک رہے تھے۔ ہیرالال جس کا مقدر پانچواں ورن تھا، یوں پہلے ورن کا آدمی تھا۔ براہمن، اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور سرخ بھی، جیسے پلّے سے پی ہو۔ گول چہرے کو لمبی قلموں نے فلینک کر رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راج بھون ہے جس کے پھاٹک پر گارڈ ہاتھوں میں بندوقیں لیے کھڑے ہیں۔ بشرٹ عنابی، فلیئرز سیمابی۔ ایسا تضاد نا داری کی وجہ سے ہوتا ہے اور یا پھر اس وقت جب آدمی کپڑے کی حد سے گزر جاتا ہے اور فن کے اوج کو چھو لیتا ہے۔ اس کی سپتم کا سا، کہیں گلے میں بیٹھ گیا تھا۔ جب وہ گاتا تو عورتوں میں کوئی بے نام سے جذبے پیدا ہو جاتے۔

ہیرالال کی بھی انٹری فلم جگت میں آبائی جائیداد کو بیچ کر آنے سے ہوئی۔ اس نے بھی فلم بنائی اور، خدا آپ کا بھلا کرے، مار کھائی۔ اس کے گرد بھی پانچویں ورن کے بیسیوں آدمی جمع ہو گئے اور اسے جینئس ثابت کر کے چلتے بنے۔ کتنے سانپ لوٹے ہوں گے ہیرالال کے سینے پر جب اپنی ہی فلم میں اسے پاپولر پلے بیک سنگر کو لینا پڑا کیونکہ میوزک ڈائرکٹر نامی تھا اور اس نے ضد پکڑ لی تھی۔ یہاں کوئی کسی نئے آدمی کو آزمانے کی ہمت نہیں رکھتا، یہ جانتے ہوئے کہ کسی وقت وہ بھی تو نیا تھا اور کسی نے اسے چانس دینے کی

حماقت کی تھی۔ ایک خلا اور خوف ہیں جو ہر آن فلم انڈسٹری کے اذہان کا احاطہ کیے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے بھی کسی دوسرے بڑے کے سہارے بڑے پکاتے ہیں۔

ہیرا کو غلط فہمی تھی کہ اس کی فلم اس بڑے پلے بیک سنگر کی وجہ سے پٹی۔ اس کا یہ وہم خود پرستی پر نہیں تو اور کس بات پر مبنی تھا؟ وہ یہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا کہ فلم کی آمریت میں پلے بیک سنگر تو ایک معدنی شے ہے، پیسے کی آکسیجن بنانے کے لیے جسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل بات تو ہیرو ہے اور ہیروئن — اور کہیں کہیں بیچ میں ڈائرکٹر۔

رہ رہ کر ہیرا کو مکتی بودھ کی یاد آتی تھی۔ وہ ہوتے تو اس کی یہ دُرگت نہ ہوتی۔ مکتی بودھ اپنے زمانے کے ٹاپ کے میوزک ڈائرکٹر تھے۔ کبھی پورے دیس میں ان کی دُھنیں گونجی تھیں۔ لیکن جب سے چوری یاری رواج ہوئے، وہ پچھڑ گئے۔ تعیش کے اس قانون میں وہ یک زوجہ آدمی — عمر بھر ایک ہی محبوبہ کو نہارتے رہے جو اب ان کا منہ چڑاتی، انھیں گالی دیتی تھی اور جس کا نام تھا سنگیتا بھارتی!

اس پر بھی مکتی بودھ اسی جوش و خروش سے خلاقی کی باتیں کرتے تھے۔ لوگ انھیں منہ پر تو کچھ نہ کہتے لیکن کچھ دور جا کر ہنس دیتے۔ ان کی غزل تک کا بھیس اب بھی پہاڑی، تلک کامود یا گوڑی پوربی ہوتا، حالانکہ آج کا تقاضا تھا کہ سرشوپاں کا ہو، دھڑ ہرسین کا اور پانو — کسی کے بھی۔

ہیرا کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا اور اب وہ اس منزل

پر پہنچ گیا تھا، جس میں آدمی آخر بے حیائی اختیار کر لیتا ہے۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھتا اور تشنجی انداز میں پورے بازو پھیلا کر کہتا ہے۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس دینے کو۔ بگاڑ لو جو بگاڑنا ہے میرا۔ سیٹھ لوگ سوچتے اب اس کا اور بگڑ ہی کیا سکتا ہے؟ حوصلے والے اس کے لیے دعا کرتے، پچیس پچاس اور بھی دے کر جاتے، تھڑدِلے دیواروں سے سر ٹکراتے اور یا پھر کچہریوں میں دھکے کھاتے۔

کبھی ایک ہاتھی میرے ساتھی کو ہیرا نے فلیٹ لے کر دیا تھا۔ احتیاج میں ہیرا اُسی میں اٹھ آیا، لیکن وہاں بھی فون پر فون آنے لگے۔ یہ آلہ جو کروڑوں کا کاروبار کرتا ہے اور یا پھر عاشقوں کی چُو چُو مُومُو کی ترسیل، ہیرا کے لیے پھنیرا سانپ ہو گیا۔ آخر ایک سہانی صبح کو ہیرا کے اس پروردے نے اس کا سامان اٹھا کر سڑک پر رکھ دیا، جو سامان بھی نہ تھا۔

وہاں، راشن کی دُکان کے تھڑے سے، جو اب ہیرا کا رین بسیرا ہو گیا تھا، ایک ہی خوبصورت چیز دکھائی دیتی تھی — نندلال کے مکان پر پھیلی ہوئی بیل!

مگر جب 'امبکا' شروع بھی نہیں ہوئی تھی تو ہیرا نے نندلال کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ 'مبادا' کے انداز میں اسے نمستے کرتا تھا اور وہ 'شاید' کے انداز میں جواب دیتا۔ پھر پبلک لیٹرن کے نل سے دھوئے بنائے ہوئے کپڑوں میں ہیرالال شری رو کرڑا کے پاس گیا، جو بہت ہی نامی پروڈیوسر تھا۔ لیکن اس نے اپنے اس نیاز مند کو دیکھنے تک کی پروا نہ کی۔ ہیرا کچھ سمجھ گیا۔ جب تک کوئی آدمی خود کو کسی کے لیے

ناگزیر نہ بنا لے، کام چلتے ہیں بھلا؟ اس نے رگھو دلال سے دوستی،
دہرائی اور ناز سینما کے پاس کافی ہاؤس میں جانے لگا۔ جہاں
کسیلی کافی کی ایک پیالی اور بھُنے سڑے ہوئے کیشونٹ کے چند دانوں
پہ فلم والوں کی قسمت بن یا بگڑ جاتی ہے۔ رگھو نے ہیرا کی مدد کرنے کا وعدہ
کیا۔ ہیرا آخر دم تک یہی سمجھتا رہا، رگھو وہ سب میرے لیے کر رہا ہے
۔ مگر وہ تو روکڑا کے انگوٹھے کا نشان چاہتا تھا۔

اپنے سیٹھ سے بات کر لینے کے بعد رگھو ہیرا کے ساتھ روکڑا
کے ہاں پہنچا۔ اتنے کم سود پر کسی کو پیسا ملے تو کون چھوڑتا ہے؟
جتنا بڑا پروڈیوسر ہو اتنا ہی سود کم لگتا ہے اور جتنا سود زیادہ
ہو اتنا ہی پروڈیوسر کم ہو جاتا ہے۔

روکڑا کو فون ہو چکا تھا۔ جب ہیرا اور رگھو، بلکہ رگھو اور
ہیرا اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے خود آکر دروازے پر اس
جوڑی کو ریسیو کیا۔ اپنے فلمی سیٹ کے سے آفس میں جیک ڈی
سیٹ میں انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور پلائی۔
باتوں میں جب روکڑا صاحب نے کہا — ہاں، ہاں، میں ہیرا لال
جی کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں تو دونوں ہیرا لال اور رگھو
نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہیرا نے ناز سے، رگھو نے نیاز سے۔
پھر انگوٹھے کا نشان یعنی دستخط وغیرہ ہوئے، رقم اس جیب سے
اُس جیب میں گئی اور دونوں خوش خوش لوٹے۔ کچھ ہی دنوں
میں ہیرا لال کو پتا چل گیا —

ہیرا لال نے دیکھا اس کی اصلی جگہ وہی ہے، جہاں روکڑا صاحب

کا چپراسی بیٹھتا ہے۔ باہر وہی دروازے پر کی سُرخ بتی صاحب کے مصروف ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ ہیرا باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ صاحب مصروف بھی رہے گا تو کتنا — دو گھنٹہ، چار — پانچ — اسے خبر نہ تھی، گھنٹے دن میں بدل سکتے ہیں اور دن مہینوں میں۔

بیچ میں رگھو نے ہیرا کو اس عالم میں دیکھا بھی اور کہا — تو تو کہتا تھا روکرڑا تیرا بڑا یار ہے، یار؟ وہ تو میں اب بھی یہی کہتا ہوں — ہیرا لال نے گھبرا کر جواب دیا، آخر انسان ہے، اس سے کبھی مصروفیت ہو ہی جاتی ہے —

ہے بھگوان — مجھے آخر چاہیے کیا تھا — یہی نا، ایک پلے بیک، روکرڑا کے پاس!

یہ ایسے ہی تھا، جیسے کوئی مفلس اوپر دیکھ کر کہتا ہے۔ اللہ! میں تجھ سے آخر مانگتا ہی کیا ہوں، یہی دو روٹیاں نا؟

ہیرا کی فریاد اس مفلس کی فریاد سے بھی زیادہ اندوہگیں تھی۔ غریب خدا کے ساتھ جُوا کھیلتا بھی ہے تو اسٹیک کیا ہوتا ہے اس کا — یہی دس پیسے نا —؟

روکرڑا دوسرے کروڑ کی فکر میں ہے۔ میں ابھی پہلے کروڑ کی — اور ہنسی، جو رونا بھی نہ تھی۔

پیسا اس کے پاس آتا ہے، جس کے پاس پیسا ہو۔ اس لیے ہیرا بھیک مانگ کر بھی کچھ پیسے جیب میں ڈال لیتا تھا، سوگندلے کر کہ وہ اس گداگری کو پیشے کے طور پر کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

کام اس کے پاس آتا ہے، جس کے پاس پہلے ہی کام ہو۔

اس لیے ہیرا صریحاً جھوٹ بولتا تھا ــ پانچ پنجروں میں پلے بیک دے
رہا ہوں میں ــ کوئی شروع نہیں ہوئی، کوئی ہو رہی ہے۔ گویا
اس نے تین روپے کمائے، جن میں دو کھوٹے تھے اور ایک چل
نہیں رہا تھا۔ جو چل نہیں رہا تھا اسے تین صرّافوں کو دکھایا،
جن میں سے دو اندھے تھے اور ایک کو دکھائی نہیں دے رہا تھا،
وغیرہ......

بیچ میں ہیرا کی مکتی بودھ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ کہ ان کی حالت
اور بھی خستہ ہو گئی ہے، ہیرالال کو ان کی باتوں سے پتا چلا ــ
بریشم قلندر! جسے میرے پاس آنا ہے آئے، نہیں آنا نہ آئے۔ میں
نا گیا کسی کے پاس۔ غضب خدا کا، یہ گھمسان کا میوزک دینے کے بعد
بھی اگر لوگ مجھے بھول گئے ہیں تو بھول جائیں۔ اور پھر، یہ ہو کیا رہا ہے دنیا میں۔
جھوٹ کا مول ہے، سچ انمول ہو کر رہ گیا ہے!

مکتی بودھ کو چاہیے تھا گھر سے باہر نکلتے تاکہ اسے دیکھ کر ہی
کسی کو تو بھولے بسرے یاد آ جائے اور کچھ نہیں تو کھلی ہوا سے
پھیپھڑے ہی صاف ہو جائیں۔

ایک بار وہ نکلے بھی ــ اور تو اور اسی سنگیتا بھارتی نے
کوڑے کی ٹوکری ان کے سر پہ خالی کر دی!

پیسے کو عورت چاہیے تو عورت کو بھی تو پیسا چاہیے!

اس کے بعد مکتی بودھ اندر ہی اندر، اور اندر اپنے آپ میں سمٹ گئے۔
جہاں انھیں اپنے ہی لہو کا سنگیت سنائی دینے لگا۔

ہیرالال ان کے پاس بیٹھا تھا، جب مکتی بودھ نے اپنے مستک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — جو یہاں لکھا ہے، ہیرا، وہ مل کر رہے گا۔

ہیرالال نے مکتی بودھ کے ماتھے کی طرف دیکھا، جہاں چند بے ربط لکیروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بائیں طرف ایک گھنڈی سی بنی تھی۔ شاید اسی نے قسمت کے بہاو کو روک لیا تھا۔ جبھی کنڈلی دیکھنے والے پنڈت، مکتی بودھ کے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جیسے اُن کا بھی سہارا چلے جانے پر انھوں نے جھلاکر ہاتھ ہارمونیم پر مارا اور تھوڑی آ آ کے بعد ایک غزل شروع کر دی، جو پیلو میں باندھی گئی تھی —

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

خشوع و خضوع کے آنسو مکتی بودھ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، جس نے ہیرا کے بھی بندھ کھول دیے۔ یہ وہ دن تھے جب نند لال کی اُمبکا ہٹ ہو گئی تھی۔ ہیرا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔

— آئیڈیا!

نند لال بُری طرح سے پانچویں ورن میں گھرا ہوا تھا، جب کہ ہیرا لال بڑی خامشی سے آکر نیاز مندانہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ صاحب سلامت تو ہو ہی چکی تھی، مگر نند لال اسے آگے بڑھنے دینا نہ چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی گجو، ڈانڈیکر، فیروزا اور ان کی قبیل کے لوگوں سے گھبرایا ہوا تھا۔ جیسے ہر امیر آدمی کی بیماری میں ملاقاتی ڈاکٹر،

حکیم اور وید بن جاتے ہیں ایسے ہی سب لوگ اسے آیندہ کے لیے مشورے دے رہے تھے۔ اگر ناکامی میں نند لال کچھ سوچ بھی سکتا تھا تو اب کامیابی میں وہ بالکل کنفیوز ہو گیا۔

نند لال جب دوسروں سے باتیں کر رہا تھا تو ہیرا لال اپنی کمین گاہ سے نظریں اس پر فوکس کرنے لگا جیسے وہ کسی مسمریزم یا تانترک ودّیا کے گرُ جاننے لگا ہو۔ احتیاج آدمی کو کیا کچھ نہیں سکھا دیتی؟

اچیٹ کر نند لال کی نظر جو ہیرا پر پڑی تو وہ اپنی نگاہیں ہٹا ہی نہ سکا۔ جیسے اس نو وارد میں کوئی خاص بات ہو۔

کیا حال ہے؟ — نند لال نے تکلفاً پوچھ ہی لیا۔

اپنی جگہ پر کسمساتے ہوئے ہیرا نے وہیں سے ڈوری پکڑ لی — بس کر پا ہے امبا جی کی۔

نند لال چونک گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے امبا ماں نے خاص طور پر اسے اس کے ہاں بھیجا ہے۔ امبا ماں جس نے چھ لاکھ کے خرچ پر کروڑ لوٹائے۔ پھر وہ ڈر گیا — کہیں یہ بھی تو وہ نہیں ہے؟!

مہینہ بھر ہیرا نے اپنا عندیہ نند لال سے چھپائے رکھا، جس سے نند لال میں ایک عجیب نفسیاتی اُلجھن پیدا ہو گئی۔ وہ اب تک لوگوں کی فرمایش اور اپنے انکار کا عادی ہو چکا تھا۔ ہیرا نے کام بھی پکڑا تو نند لال کے نئے دفتر کا۔ وہ پائی پائی پر انٹیریر ڈیکوریٹر سے لڑتا۔ پچیس ہزار کے خرچ پر نند لال اُسے پانچ ہزار ایڈوانس دینا چاہتا تھا، لیکن ہیرا لال نے اس کے ہاتھ روک لیے اور اُسے پانچ سو میں نپٹا لیا۔ کچھ دن کے بعد پھر اسے ایک ہزار دے دیا — آخر

سامان تو ہمیں ہی دینا ہے، اسے تو سب اپنے دماغ ہی سے نکالنا ہے نا۔ وہی دلیل جس کی وجہ سے کوئی فن کار اپنے پیشے سے روٹیاں نہیں نکال سکا۔ لیکھک کو ساتھ میں پیاز کی دُکان ضرور کھولنی چاہیے۔

اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ جو آدمی پیسے کے لیے لٹکایا جاتا ہے، زیادہ تندہی سے کام کرتا ہے۔ پھر ہیرا نے شدھا بھابی سے پوجا کا معاملہ طے کیا۔ نند لال شدھا کو ہمیشہ اِگنور کیا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ ہیرا ہی کی وجہ سے تھا کہ سدھا کو دفتر کے مہورت پر رکھ رکھا گیا۔ پوجا میں تو وہ تھی ہی تھی، لیکن دوسری باتوں میں بھی سب سے آگے۔ اصل میں وہی دیوی تھی جس کے پانو کی خیرات سے نند لال بنا۔ سینکڑوں لوگ نند لال کے لیے نہیں، 'امبکا' کی کامیابی کی خاطر آتے تھے۔ وہ پہلے شدھا کو نمسکار کرتے تھے، جس سے اسے اپنا وجود ضروری، خوبصورت اور امبکا معلوم ہونے لگا تھا۔

ہیرا نے اس قدر خوبصورت طریقے سے نند لال کو گرگوں سے بچایا تو نند لال کے دل میں اس کے لیے عزت بڑھ گئی۔ پھر آیا وہ آئیڈیا کا دن!

دن ابھی شام میں ڈھل نہ پایا تھا کہ نند لال ہی کے گھر میں ہیرا نے عشاء کی نماز کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت وہ وضو کر رہا تھا، جب کہ نند لال چونکا — تم مسلمان ہو؟

نہیں تو

تو پھر — یہ؟

میں سیکھ رہا ہوں، نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟
وہ کس لیے؟
میں ایک مسلم سبجیکٹ بنا رہا ہوں، نند لال جی — ہیرا نے کچھ رُکتے ہوئے کہا — دراصل میں اس کا ٹائیٹل اِمپا میں رجسٹرڈ کروا آیا ہوں اور اس نے جیب میں سے رسید نکالی۔ واقعی ٹائیٹل ہیرالال پنڈت کے نام رجسٹرڈ تھا، اور وہ تھا — سجدہ!
ارے! — ہیرا نے ایک دم کہا، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات ایکدم اُسے یاد آگئی اور جو پہلے ہی کوندے کی طرح سے لپک کر نند لال کے دماغ میں آچکی تھی اور اسی لیے منطبق ہوگئی — یہ فلم آپ کو بنانی چاہیے۔ آپ جو کسی بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں، آج ہو گیا — فیصلہ! بات یہ ہے، 'امبکا' بنانے کے بعد آپ نے پوری ہندو قوم کو رام کرلیا ہے، 'سجدہ' سے پوری مسلمان قوم کو رحیم کر سکتے ہیں۔
ہیرالال —
جی، نند لال جی؟
ٹائیٹل . . . .
ٹائیٹل میرے نام ہے تو کیا ہوا؟ — آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔
نہیں، میں سوچ رہا تھا — ٹائیٹل بہت دھانسو ہے۔
جب ہی ہیرالال کو پتا چل گیا کہ وہ نشانے سے تھوڑا آگے ہی نکل گیا ہے۔ چنانچہ اس نے باتوں میں اُلجھائے رکھنے کی بات سوچی۔

یوں بھی دن بھر اِدھر اُدھر جھک مارنے سے نند لال کی مدافعت کی سب قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ پھر اُس وقت وہاں کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ سُدھا بھابی جی کے ساتھ سازش کر کے اُس نے آنے جانے والوں کے تانتے کو بکھیر دیا تھا۔ اس وقت وہ نند لال اور اس کے خدایا دیوی کے بیچ اکیلے تھے — ہیرا کہے جا رہا تھا مسلمانوں کے اٹھنے بیٹھنے، ان کے کلچر میں وہ بات ہے جو ہندوؤں کو بھی بہت پسند آتی ہے — دیکھو نا، بیٹی کیسے باپ کو آداب کہتی ہے اور ساتھ میں ابّا حضور بھی۔ سامنے آکر بھی کتنا خوبصورت پردہ ہے جو آج کے ننگے پن میں کہاں ہے؟

میں سمجھ گیا۔

نہیں، آپ نہیں سمجھے — مسلمان جو بھاشا استعمال کرتے ہیں، وہ کتنی سندر ہے۔ شکیلہ بانو بھوپالی جب قوالی کرتی ہیں تو گجراتی ہندو بھی پاگلوں کی طرح سے داد دیتے ہیں، چاہے ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

اُس کی بات چھوڑو — وہ سب سمجھا دیتی ہے۔

اس پر نند لال اور ہیرا دونوں مل کر ہنسے۔ انھوں نے دیکھا کہ سُدھا بھی کبارڈ کے پیچھے کھڑی ہنس رہی ہے!

پھر مشاعرے پر بات چلی آئی، جس کے سامنے کوی سمیلن کا رنگ نہیں جمتا۔

تو — 'امبکا' کے بعد 'سجدہ' — بیچ میں نعت، قوالی، مشاعرہ کوٹھا، غزلیں، چوڑیدار، مقیش لگے، لہراتے ہوئے دوپٹے، اور

آخر — پیسا!

بات ہوچکی تھی، مگر نند لال کا قدرتی حربہ آڑے آرہا تھا، یعنی کہ سر کے جھٹکے۔ کبھی لگتا تھا فلم بنے گی، کبھی نہیں بنے گی، بنے گی، نہیں بنے گی —

میوزک ڈائرکٹر کے طور پر مکتی بودھ جی کا نام تجویز ہوا تھا، اس لیے کہ وہی ایک ایسے آدمی تھے، جو ہیرا لال کے پلے بیک سنگر بننے کے خواب پورے کر سکتے تھے۔ ہیرا نے نند لال کے سامنے اپنی بات ہی نہ کی، کیونکہ اندر سے وہ جانتا تھا کہ مکتی بودھ آجائیں گے تو وہ خود بھی آجائے گا۔ اس کا چانس سینٹ پَرسینٹ ہے۔ نندلال کا اعتراض تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکتی بودھ ایسا سنگیت کار انڈیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا، لیکن آج کل وہ بکتے نہیں۔ دوسرا ہندو ہونے کے ناطے وہ نعت کیسے بنائیں گے؟ پلے بیک سنگر بھی چوٹی کا ہونا چاہیے کیونکہ اُردو بھاشا میں 'ک' دو طرح کے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک گلے سے نکلتا ہے اور دوسرا — دوسرا نامعلوم کہاں سے؟ ایسے ہی 'س' 'ا'، 'آ' — عرق عشبہ کو ٹھیک سے بولیں تو اُتار (عطار) کا لڑکا کہے گا — ہے تو میرے پاس، پر اتنا گاڑھا نہیں ہے — اور ہیرا کانپ گیا۔

لیکن جیسے تیسے اتنے بڑے آدمی کو، جس کی 'امبکا' ہٹ ہوگئی تھی، مکتی بودھ کے گھر لے ہی آیا۔ نند لال نے بڑی عقیدت سے ان کے چرن چھوئے، مکتی بودھ جی نے وہسکی اور دوسرے لوازمات کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جتنی دیر یہ سب لوگ پیتے پلاتے،

پیتے کھاتے رہے، مکتی بودھ مسلم کلچر ہی کی باتیں کرتے رہے۔ آخر طے ہوا کہ گوروار کے روز ان سے کانٹریکٹ کریں گے کیونکہ وہی دن دیوی ماں کا ہے۔ نند لال نے جاتے ہوئے بھی اتنے بڑے میسٹرو کے پانو پر سر رکھا اور مکتی جی کو یقین ہو گیا کہ اس دن اُن کا کانٹریکٹ ہو ہی جائے گا۔ دونوں لال چلے گئے، پیچھے وہی دو ٹوٹڑو رہ گئے لیکن آج اُس بڑھیا سنگیتا نے اپنے بڈھے کے لیے گاجر کا حلوہ بنایا تھا۔

فلمی دنیا میں ہر خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ جہاں اتنے بڑے پروڈیوسر کی تصویر میں میوزک دینے کے لیے لوگ مکتی بودھ کے پاس آنے لگے، وہاں قرض خواہ بھی جو مایوس ہو چکے تھے مکتی بودھ سب کو کہنے لگے — آپ گوروار کے روز آ جائیے اور اپنا حساب لے جائیے — اور پھر..... نہیں نہیں گوروار نہیں۔ میرا خیال ہے اگلے منگل۔ بات یہ ہے نند لال چیک میں پیسے دے گا تو وہ سنیچر کو بینک میں پڑیں گے اور آپ تو جانتے ہیں، اس دن کوئی کلیرنس نہیں ہوتی۔ سوموار کو چیک جائے گا اور منگل کی شام کو میرے بینک میں آئے گا۔ اس لیے بدھ ہی کو آئیں تو اچھا ہے۔ مکتی بودھ حیران ہوئے کہ کسی کو ان کی یہ بات بُری نہیں لگی۔

رات جب مکتی بودھ سونے لگے تو ایک عجیب سی شکر گزاری کا جذبہ ان پر رینگنے لگا — آخر بھگوان نے سن لی میری۔ دینا ناتھ شاستری، جیوتش آچاریہ تو کہتے بھی تھے کہ بس آپ کے ایسے دن آنے والے ہیں کہ آپ پہلے کے شِکھر سے بھی اوپر پہنچیں گے

ایک نہیں شاید آپ کو پانچ چھے کانٹریکٹ بھی ملیں۔ ہوسکتا ہے راج دربار کی طرف سے مان بھی پراپت ہو۔ بس جب آپ کے چاند پر سے منگل گزر جائے گا تو پتنی کی طرف سے بھی چنتا نہ رہے گی۔ اور گورُو کے مارگی ہوتے ہی لکشمی آپ کے گھر ڈیرا ڈال لے گی۔ پھر انھیں بیوی کا خیال آیا۔ وہ ہنسے — ایک گھر میں دو عورتیں کیسے رہ سکتی ہیں؟!

سِٹی سول کورٹ سے ایک ٹاپخ بھی مکتی بودھ جی کے ہاں کی سب چیزوں پہ لگی تھی۔ جب لال برادران وہاں تھے تو بڑھیا نے کس صفائی سے سب چیزوں پر لگی ہوئی ٹاپخ کی چیپیاں چھپادی تھیں کسی پر میزپوش ڈال دیا تھا، کسی پر چادر۔ اگلے ہی روز بیلف وغیرہ کو کچھ دے دلا کر مکتی بودھ جی نے سامان پر قبضہ اور نیلامی کی تاریخ اگلے ہفتے تک ملتوی کروالی تھی۔

گورو وار کے دن بھی نند لال ہی کو مکتی بودھ جی کے ہاں آنا تھا۔ پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ جب چھے ساڑھے چھے ہوئے تو ہیرا کی شکل دکھائی دی۔ اس نے بتایا کہ نند لال کو لیبارٹری میں 'امبکا' کے نئے پرنٹ بنوانا تھے، اس لیے دیر ہوگئی۔ بات یہ ہے، اس فلم 'امبکا' کے ڈیڑھ سو پرنٹ بنوائے اور نیگیٹو گھِس گیا۔ اس لیے ہم ایک پرنٹ سے ڈیوپ نکال کر اس سے کاپیاں بنوائیں گے۔ ڈیوپ سے جو پرنٹ نکلا ہے، انکل! اس کے مقابلے میں پہلا پرنٹ بھی کچھ نہیں۔ آپ میری خاطر اس کوتاہی کو بھول جائیے۔ آپ میری مدد تو کر ہی رہے ہیں، تھوڑی اور کر دیجیے

اور وہ یہ کہ آپ نندلال جی کے گھر ہی چلے چلیں ـــــــ آنا کانی کا کوئی بہانہ ہی نہ رہے۔ دیکھیے آپ کی عزت میری عزت ہے اور میری عزت تو کچھ ہے ہی نہیں۔ آخر وہ اتنا بڑا اور کامیاب پروڈیوسر ہوکر آپ کے گھر آیا ہی تھا نا۔ آپ کے چرن بھی چھوئے ہی تھے نا۔

مکتی بودھ جی شاید کچھ سوچتے مگر بڑھیا نے انھیں کوئی موقع ہی نہ دیا۔ تسلا جس میں چاول رکھتے تھے، اسے خالی دکھا دیا۔ مکتی بودھ اٹھے اور ہیرا کے ساتھ چل دیے۔ جب ہیرا کہہ رہا تھا، میرے پلے بیک کی بات ابھی نہیں، بعد میں کیجیے گا، جب آپ کا کانٹریکٹ ہو جائے۔

لاطور بھون میں نندلال کی بیوی سُدھا نے ان کی خاطر وغیرہ کی۔ دس بجے تک زندگی کے یہ دو کنارے آپس میں اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ پھر گیارہ بج گئے، بارہ اور خون مکتی بودھ کے سر کو آنے لگا۔ میں نے غلط کیا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کبھی ایک جھوٹ میں سے دس سچ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ـــــ نندلال آخر انسان ہے اور انسان سے مصروفیت ہو ہی جاتی ہے۔ نندلال کو اب لے ہی آؤ، پرماتما، نہیں موت کا بیلف کیسے ٹلے گا؟

نندلال اپنی اسی گھچ گھچ کرتی مگر لکی گاڑی میں اُس وقت یعنی کہ رات کے ایک بجے آیا جبکہ مکتی بودھ ایسی تیسی کہہ کر چلنے ہی والے تھے۔ نندلال لنگڑا رہا تھا۔ پتا چلا اچانک پیچش ہو جانے سے اسے ڈاکٹر کے پاس جا کر سرین کے اوپر ٹیکے لگوانے پڑے جو ابھی درد کر رہے تھے۔ شکروار دیوی ماں کا دن ہے نندلال نے

بتایا، اور اس روز وہ برت رکھتے ہیں۔ صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ مکتی بودھ نے کہا۔ پہلے کھاؤ، پھر بات کریں گے۔ آخر انسان اتنی دوڑ دھوپ کرتا کس لیے ہے؟ بہو! چاول میں دہی زیادہ دینا ذرا، اور مکتی بودھ نے کسی اضطرار میں اپنا ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا اور اسے سہلانے لگے۔

ہیرا اور مکتی بودھ ٹیرس پر بیٹھے تھے، جہاں ان پر اُوس پڑ رہی تھی۔ یہاں اُوس پڑ رہی ہے، انکل! ہیرا لال نے کہا، اندر نہ چلے جائیں؟

مکتی بودھ بولے —— نہیں بیٹا اس کا تو کچھ نہیں، وہ ہماری امیدوں پر نہ پڑے، بس —— اور پھر وہ کھسیانہ سی ہنسی ہنس دیے۔

سب کچھ ہو جانے کے بعد نند لال آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مکتی بودھ سے معافی مانگی اس لیے نہیں کہ وہ لیٹ ہو گیا تھا، بلکہ پیسے لیٹ ہو گئے تھے ابھی تک تو بندوبست نہیں ہوا مگر بدھ تک ضرور ہو جائے گا۔

جانے مکتی بودھ جی نے کیسے کہہ دیا۔ کوئی بات نہیں، بیٹا! بدھ کون سا دُور ہے؟ حالانکہ ان کے دماغ میں دلال، سیٹھیے، بیلف کیا کچھ گھومنے لگا تھا اور ان سے زیادہ اپنی بڑھیا جو گھوم ہی نہیں رہی تھی۔

باقی ذمے داری ہیرا کی تھی کہ وہ بڑھؤ کو سمجھا دے کہ پیسا کوئی آسانی سے ڈھیلا نہیں کرتا۔ دامبکا، میں کروڑ کا بزنس ٹھیک ہے لیکن وصولی بھی تو کوئی چیز ہے؟ پچیس ہزار تو دفتر کی انٹیریر

ڈیکوریشن میں لگ گیا ہے — ارے صاحب، ڈسٹری بیوٹر اور پیسا دیں ہ، کیا کیا جھوٹے وَوُچر اور حساب نہیں بناتے ؟ شہر شہر گانو گانو جاکر چیکینگ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لیے ایجنٹ رکھیں تو اسے پانچ سو ہزار سے کیا کم دیں گے ؟ اگر ڈسٹری بیوٹر اس کی جیب میں پانچ ہزار ڈال دے، ساتھ شراب پلائے اور کوٹھے پر گانا سننے کے لیے لے جائے تو بتائیے وہ ایجنٹ آپ کا ہوا یا ڈسٹری بیوٹر کا؟ ایمان داری نام کی یہاں کوئی چیز ہی نہیں۔ ایک ہی ایمان دار ایجنٹ ملا تھا، چیکینگ کے ایک ہفتے کے اندر جس کی لاش ٹائلیٹ سے ملی — !

خیر، ہیرا کیسا بھی تھا مگر تھا تو مکتی بودھ جی ہی کا بہی خواہ۔ ساتھ نند لال کا بھی۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے — اصل میں وہ اپنا ہی خیر خواہ تھا۔

لاطور بھون کے ٹیرس سے اٹھ کر چلتے ہوئے مکتی بودھ جی نے صرف اتنا ہی کہا — یہ کا ہے کی بیل ہے ؟

مارننگ گلوری کی — نند لال نے جواب دیا۔

مکتی بودھ جی نے اپنی نظریں بچاتے ہوئے کہا — تو پھر ایوننگ گلوری کی بھی کوئی ہو گی ؟ — اور پھر وہ ہنس دیے، چل دیے۔

ہیرا میں باقی تو سب ٹھیک تھا، لیکن ایک بات غلط تھی۔ اس نے مکتی بودھ جی کی پوری رقم اور سائیننگ اماؤنٹ بھی خود ہی طے کر دی تھی۔ جیسے وہ، مکتی جی، کوئی بات ہی نہیں —

ظالم! پوچھ تو کیا ہوتا؟ فلم میں جو آتا ہے، رشتے جگا لیتا ہے۔ ارے بھائی، ہمیں اپنا بیٹا نہیں بیاہنا ہے۔ یہ کمرشل دنیا ہے، اس ہاتھ سے کام لو، اُس ہاتھ سے دام دو اور بس — اس سے پہلے یہ بکواس کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہوئی بھی تو ہم نے کانٹریکٹ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ اور اب، وہ جگر اب میں کہاں سے لاؤں؟ — یہ ہیرا؟ کہتا ہے میں نے نند لال کو کہہ بھی دیا کہ انکل کا تو کچھ نہیں، وہ درویش آدمی — ارے درویش کو کیا حاجت نہیں ہوتی؟ پھر — فلمی دنیا گروپ سے چلتی ہے۔ آپ ایک بار اس گروپ میں گھس تو جائیے، انکل! 'امبکا' گروپ — آج کے سب سے بڑے اور کامیاب پروڈیوسر نند لال کا گروپ — ارے، بڑے نند لال آئے اور بڑے گئے — اس کے ذریعے آپ کو دس تصویریں ملیں گی۔ ارے۔ تیے، مجھے اسی ایک کی ضرورت ہے، بعد کی دس اور بیس کی نہیں — کبھی میرا بھی وقت تھا، جب تمھارے ایسے آدمی کو ہفتہ ہفتہ باہر بٹھائے رکھتا تھا۔ کہیں غلطی سے وہ اپنا تھوبڑا میرے کمرے میں لے تو آئے میں چلّا کر کہتا تھا — گیٹ آؤٹ۔ گیٹ۔ آؤٹ۔

اور اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے مکتی بودھ سچ مچ چلا اُٹھے — گیٹ آؤٹ۔۔۔۔۔

بُڑھیا ہڑ بڑا کے اُٹھی — کیا ہوا؟

مکتی بُودھ کی سانس دھونکنی کی طرح سے چل رہی تھی — وہ ماتھے پر سے انفعال کے قطرے پونچھ رہے تھے۔

وہی ہو رہا ہے، جو تیرے ایسے کھوسٹ کا ہونا تھا — بڑھیا

نے کہا اور واپس اپنے بوڑھے بستر پر لیٹ گئی۔

جس دیری سے تقاضا کرنے والوں کو مکتی بودھ جی نے بدھ کا وقت دیا تھا، اسی بے حیائی سے اگلے سنیچر کا دے دیا (چیک بدھ کو بینک میں پڑے گا، تو . . . . وغیرہ) حیرانی کی بات یہ کہ بیسیوں ہی آئے مگر ٹالے جانے پر کسی نے اُف بھی نہ کی۔ کیا ارادے تھے ان کے؟ وہ شور مچاتے، نالش کی دھمکی دیتے، مگر یہ چُپ؟! رام جانے یہ سب مل کر کیا کرنے والے ہیں؟ مکتی بودھ کانپ رہے تھے۔

بدھ کے روز موعودہ وقت پر ہیرا نندلال کی پتنی سُدھا کے ساتھ چلا آیا۔ سدھا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا جو اس نے مکتی بودھ جی کے آگے رکھ دیا — منہ میٹھا کیجیے، انکل!

مکتی بودھ اور ان کی بڑھیا نے ڈبہ لے لیا اور انتظار کرنے لگے۔

ہیرا بولا — میں آپ کے گھر میں ان لکشمی کو لے آیا ہوں — اور اس نے سُدھا بھابی کی طرف اشارہ کیا — سُدھا بھابی سے بڑی لکشمی کیا ہوگی؟ بات یہ ہوئی کہ نندلال اوور فلو لینے کے لیے کلکتہ چلے گئے ہیں۔ ہفتہ بھر میں لوٹ آئیں گے۔ جاتے سمے انھوں نے تاکید کی کہ مکتی بودھ جی کو میرا اچانک چل دینا برا نہ لگے، اس لیے تم میری بیوی کو لے جانا اور ساتھ برج واسی کے ہاں سے رس ملائی کا ایک ڈبہ بھی — اپنی عورت سے بڑی آدمی کی عزت کیا ہوتی ہے؟ مکتی بودھ جی نے سر ہلایا اور بولے — ہوں، اور ایک نظر اپنی بڑھیا کی طرف دیکھا — ان میں پُرانے جلال کے دن پھڑپھڑا کر رہ گئے —

اِدھر ہیرا اور سدھا گئے، اُدھر ٹاپخ والے گھر سے ریڈیو گرام، اسپیکر، ٹیپ ریکارڈ، ہارمونیم، ستار، فرنیچر اور کچھ برتن اٹھا کر لے گئے ___ اس کا کیا ہے، مکتی جی نے سوچا، دس دن میں پیسے آجائیں گے تو چیزیں بھی لوٹ آئیں گی، جب تک انھوں نے نیلام نہ کر دی ہوں تو ___ کر بھی دی ہوں تو نئی خریدیں گے۔ آخر ایک آدمی نے اپنی عورت، اپنی عزت میرے گھر بھیجی ہے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؛ یہ کوئی آزمائش ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے دس دنا میں نندلال کلکتہ سے لوٹ ہی آئے۔

جب ٹاپخ والوں نے گھر کی چیزوں پر ہاتھ ڈالا تو مکتی بودھ کی بڑھیا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ یہ اچھا ہی ہوا، اگر وہ ہوش میں ہوتی تو دوسروں کے ہوش ٹھکانے کر دیتی۔ وہ مغلظات سناتی کہ بس۔

دس دن بیت گئے لیکن نندلال کلکتہ سے نہ لوٹا۔ اب ہیرا مکتی بودھ جی سے بچتا پھر رہا تھا ___ نندلال کا ہاتھ رو کنے اور مکتی بودھ کو پیسا دلوانے کے بیچ میں وہ کہیں بٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنا آدرش دور ہٹتا، خود میں کہیں گم ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ نندلال کہیں اس سے بھی کھیل تو نہیں کر گیا؟ نہیں وہ ایسا آدمی تو نہیں ہے۔ ہیرا نے ایک بار مکتی بودھ کو مل کر بتایا کہ اوورفلو جھگڑے میں پڑ گیا ہے۔ اسی لیے نندلال نہیں آیا، مگر آئے گا ضرور، کچھ دن میں۔ کہاں جائے گا؟

مکتی بودھ جی ہیرا کی بات پر ہونٹ بھینچ کر صرف ایک ہی

کہتے رہے۔ ہوں! لیکن جب ہیرا جلا جاتا تو اپنے آپ سے کہتے ــ مکتی! تجھے کیا ہو گیا ہے، کیوں نہیں تو ان پلّوں کو ٹھڈّے مار کر باہر نکال سکتا؟ اب رہ ہی کیا گیا ہے ــ؟

اسی سلسلے میں ایک دن مکتی بودھ جی نے دُلارے، اپنے شاگرد کو بھیج کر استاد کلب علی کا سِتار منگوایا، جس پر ہاتھ رکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گئے۔ بجاتے ہوئے کیسے وہ اس ساز سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے بازوؤں میں کوئی محبوبہ ہے۔ جس پر جھک جھک کر، جسے چوم چوم کر، جس پر انگلیاں دوڑا دوڑا کر، وہ کسی نئی زندگی کے سُر نکال رہے ہیں۔ ــ بُڑھیا دیکھ رہی تھی اور کباب ہو رہی تھی۔ یہاں کی عورت، وہاں کی عورت کی ہمیشہ حاسد رہی ہے ــ یہ کہ اُسے اپنی ذات میں کھو کر، اپنے مالک میں مدغم ہو کر اُس کی ملکہ ہو جانا چاہیے، سب باتیں ہیں ــ وہ تو اپنے میاں کی ہردل عزیزی نے بھی جل بھن کر راکھ ہو جاتی ہے ــ

ایک جھالے کے بعد یکدم مکتی بودھ جی نے سِتار ایک طرف رکھ دیا اور پھر وہی اپنے آپ پر رحم ــ اس پر بھی تو یہ سب اپنے آپ سے ہوتے دیکھ رہا ہے مکتی ــ کیوں نہیں تو تند لالوں سے کہہ سکتا ــ نہیں چاہیے مجھے تمھارا سجدہ، جو سجدہ ہی نہیں ــ

پھر انھیں رستم کے آخری دن یاد آ جاتے، جن میں وہ روتا اور سر اوپر اُٹھا کر، ہاتھ پھیلا کر کہتا ــ اللہ! کہاں گئے وہ میرے دن جب میں چلتا تھا تو میرے پاؤں زمین میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ اور آج ۔ ؟

پھر وہ نعت جس کی دُھن اپنی بیکاری کے دِنوں میں مکتی جی نے نکالی تھی، جسے گاتے ہوئے انھوں نے بیچ میں سب بند کر دیا۔ یہ بھیرویں، یہ ٹوڈی — کیا میاں کی اور کیا بیوی کی اور کیا کھماج سب بکواس ہیں۔ قرآن کی بھی تو آیت ہے، جس رُخ زمانہ پھرے، اُسی رُخ پھر جاؤ۔ . . . میں نہیں پھر سکتا، میری ہڈیاں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ جو ٹوٹ سکتی ہیں، مُڑ نہیں سکتیں۔

نہیں! میں یہ نہیں کروں گا — میں نہیں مرغِ بادگرد، میں نے اپنے سنگیت، اپنی ماں سے پیار کیا ہے، ایشور! عورتیں بیسیوں، سیکڑوں ہو سکتی ہیں، ماں صرف ایک . . . . کیا میں بھوکا بھی نہیں مر سکتا؟ یہ آزادی مجھ سے کوئی نہیں، کوئی نہیں چھین سکتا —

نندلال دس دن بعد بھی نہ لوٹا، بیچ میں ہیرا مکتی بودھ جی کے گھر کا طواف کرتا رہا۔ مگر ان کا دروازہ کھٹکھٹانے، اندر جانے کی اس کی ہمت نہ پڑی۔ شاید وہ مکتی بودھ جی سے اتنا نہ ڈرتا تھا، جتنا اُن کی بڑھیا سے۔

اب کے جو ہیرا آیا تو ایک تار سے مسلح۔ تار کلکتہ سے آیا تھا، جس میں لوٹنے کا تیتھ وار سبھی لکھے تھے۔ اس دستاویز کو کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر مکتی بودھ پھر کچھ بھول گئے — اور آنکھیں سکوڑ کر کہیں دور دیکھتے ہوئے بولے — ہوں . . . . !

ہیرا اندر سے جانتا تھا کہ اگر مجھے مکتی بودھ جی کی ضرورت ہے تو انھیں بھی میری — اور نندلال کی — مقررہ تاریخ کو نندلال واقعی چلا آیا۔ ہیرا اُسے گھیر گھار کر مکتی جی کے ہاں لے ہی آیا۔

بیا تیقن سے اس کے ہاتھ گھنٹی پر پڑے۔ بہت دیر تک اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ آخر پتا چلا کوئی آرہا ہے۔ دروازہ کھلا تو سامنے بُڑھیا تھی جو انھیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کانچ تھا۔ سارے چہرے پر پرچھائیاں پھیلی تھیں۔ اور جھریوں میں کوئی سلِٹ جمی تھی، جیسے طوفان اور باڑھ کے بعد چھوٹے بڑے ندی نالوں میں جم جاتی ہے۔

بُڑھیا نے ان کو جانے کے لیے کہا نہ بیٹھنے کے لیے۔ اس پر بھی وہ اندر جا کر بیٹھ گئے۔

ہیرا نے پوچھا — انکل کہاں ہیں آنٹی؟

پہلے تو وہ ایسے ہی بڑبڑ دیکھتی رہی۔ آخر بولی — جانے کہاں کھپ گیا ہے، بڑھئو..... اسے تو موت بھی نہیں آتی.. ..... کیا کیا تو نے نہ کیے میں نے....

تین گھنٹے انتظار کے بعد نند لال چیک سمیت لوٹ گئے۔ ہیرا نے اور کوئی دیر دیکھ لینے کو کہا، مگر نند لال راضی نہ ہوا۔ اٹھتے ہوئے نند لال نے تسلی کے لیے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، چیک وہیں تھا! ہیرا کی حالت ابتر تھی البتہ۔ اتنی محنت سے بنائی ہوئی اس کی عمارت ڈھے گئی تھی۔ جس ٹھیکے دار کو اسے بننے کے لیے دیا تھا، اس نے سیمنٹ سے زیادہ ریت اس میں ملا دی تھی۔

ہیرا گم صم جا رہا تھا کہ دُور سے اس کے کان میں کوئی دھن سنائی دینے لگی — جو پلّو میں بندھی تھی —

ہیرا نے نند لال سے پوچھا — آپ کو کوئی آواز سنائی

نہیں دیتی، اس اینٹوپ ہل کے پیچھے سے جہاں عرب ساگر ہے۔؟
نندلال نے سننے کی کوشش کی اور بولا ۔ نہیں تو — ہاں —
نہیں تو —

ایک باپ بکاؤ ہے

دیکھی نہ سنی یہ بات جو ۲۴ر فروری کے "ٹائمز" میں چھپی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اخبار والوں نے چھاپ کیسے دی. خرید و فروخت کے کالم میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی اشتہار تھا. جس نے وہ اشتہار دیا تھا، ارادہ یا اس کے بغیر اسے معمے کی ایک شکل دے دی تھی. پتے کے سوا اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے خریدنے والے کو کوئی دلچسپی ہو — بکاؤ ہے ایک باپ۔ عمر اکھتر سال، بدن اکہرا، رنگ گندمی، دمے کا مریض۔ حوالہ باکس نمبر ایل ۶۷، ۴، معرفت ٹائمز۔۔

اکھتر برس کی عمر میں باپ کہاں رہا — دادا نانا ہوگیا وہ تو؟ عمر بھر آدمی ہاں ہاں کرتا رہتا ہے، آخر میں نانا ہوجاتا ہے۔

باپ خرید لائے تو ماں کیا کہے گی، جو بیوہ ہے۔ عجیب بات ہے نا، ایسے ماں باپ جو میاں بیوی نہ ہوں۔

ایک آدمی نے اُلٹے پانو دنیا کا سفر شروع کردیا ہے۔ آج کی

دنیا میں سب سچ ہے بھائی سب سچ ہے۔
دمہ پھیلائے گا
نہیں بے — دمہ متعدی بیماری نہیں
ہے
نہیں
ہے
ان دو آدمیوں میں چاقو چل گئے — جو بھی اس اشتہار کو پڑھتے تھے، بڈھے کی سنک پہ ہنس دیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیتے اور پھر اٹھا کر اسے پڑھنے لگتے جیسے ہی انھیں اپنا آپ احمق معلوم ہونے لگتا، وہ اس اشتہار کو اڑوسیوں پڑوسیوں کی ناک تلے ٹھونس دیتے —
ایک بات ہے۔ گھر میں چوری نہیں ہو گی
کیسے؟
ہاں، کوئی رات بھر کھانستا رہے
یہ سب سازش ہے، خواب آور گولیاں بیچنے والوں کی
پھر — ایک باپ بکاؤ ہے!
یوں لوگ ہنستے ہنستے رونے کے قریب پہنچ گئے۔
گھروں میں، راستوں پر، دفتروں میں بات ٹھاک ہونے لگی، جس سے وہ اشتہار اور بھی مشتہر ہو گیا۔
جنوری فروری کے مہینے بالعموم بہت جھڑکے ہوتے ہیں — ایک ایک دارھ نہ کے نیچے بیس بیس جھاڑو دینے والے، سڑکوں پر گرے

سوکھے سڑے، بوڑھے پتّے اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتے ہیں، جنھیں اُن کو گھر لے جانے کی بھی اجازت نہیں کہ انھیں جلائیں اور سردی سے خود اور اپنے بال بچّوں کو بچائیں۔ اس پت جھڑ اور سردی کے موسم میں وہ اشتہار گرمی پیدا کرنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ سینک میں بدل گئی۔

کوئی بات تو ہو گی ؟!

ہو سکتا ہے، جیسے جایداد والا . . .

بکواس — ایسے میں بکاؤ لکھتا ؟

مشکل سے اپنے باپ سے خلاصی پائی ہے۔ باپ کیا تھا، چنگیز ہلاکو تھا سالا۔

تم نے پڑھا، مسز گوسوامی ؟

دھت — ہم بچّے پالیں گی، سُدھا، کہ باپ ؟ ایک اپنے ہی وہ کم نہیں گو — سوامی ہے ! ہی . . . . ہی ہی

باپ بھی حرامی ہوتے ہیں . . . . .

باکس ایل ۶، ۷ ۴ میں چٹھیوں کا طومار آیا پڑا تھا۔ اس میں ایک ایسی چٹھی بھی چلی آئی تھی، جس میں کیرل کی کسی لڑکی مس اونی کرشنن نے لکھا تھا کہ وہ ابو دھابی میں ایک نرس کا کام کرتی رہی ہے اور اس کے ایک بچہّ ہے۔ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ شادی کی متمنی ہے جس کی آمدنی معقول ہو اور جو اس کی اور بچّے کی مناسب دیکھ بھال کر سکے چاہے وہ کتنی عمر کا ہو — اس کا کوئی شوہر ہو گا، جس نے اسے چھوڑ دیا۔ یا ویسے ابو دھابی کے کسی شیخ نے اُسے اٹھا پلٹا دیا۔ چنانچہ غیر متعلق ہونے کی وجہ سے وہ عرضی ایک طرف رکھ دی گئی

کیوں کہ اس کا بکاؤ باپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال ان چٹھیوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہیڈلے چیز، رابن سن، اروِنگ اور اگاتھا کرسٹی کے سب پڑھنے والے اِدھر پلٹ پڑے ہیں۔ کلاسی فائیڈ اشتہار چھاپنے والوں نے جنرل منیجر کو تجویز پیش کی کہ اشتہاروں کے نرخ بڑھا دیے جائیں۔ مگر نوجوان بڈھے یا بڈھے نوجوان منیجر نے تجویز کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا ——— SHUCKS — ایک پاپولر اشتہار کی وجہ سے نرخ کیسے بڑھا دیں؟ . . . . اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پولیس پہنچی۔ اُس نے دیکھا ہندو کالونی، دادر میں گاندھرو داس، جس نے اشتہار دیا تھا، موجود ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں بِکنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی قانونی رنجش ہے تو بتائیے ——— وہ پان پہ پان چباتا اور اِدھر اُدھر دیواروں پر تھوکتا جا رہا تھا۔ مزید تفتیش سے پتا چلا کہ گاندھرو داس ایک گائیک تھا، کسی زمانے میں جس کی گائیکی کی بڑی دھوم تھی۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کی موت ہو گئی، جس کے ساتھ اس کی ایک منٹ نہ پٹتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک اوندھی محبت میں بندھے ایک دوسرے کو چھوڑتے بھی نہ تھے۔ شام کو گاندھرو داس کا ٹھیک آٹھ بجے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی لین دین نہ رہ جانے کے باوجود یہ احساس ضروری تھا کہ ——— وہ ہے۔ گاندھرو داس کی تان اُڑتی ہی صرف اس لیے تھی کہ دَمینتی، اُس کے سنگیت سے بھرپور نفرت کرنے والی بیوی گھر میں موجود ہے اور اندر کہیں گاجر کا حلوا بنا رہی ہے اور دمینتی کے لیے یہ احساس تسلی بخش تھا کہ اُس کا مرد جو برسوں سے اسے نہیں بُلاتا، ساتھ کے بستر پر

پڑا شراب میں بدمست خراٹے لے رہا ہے۔ کیوں کہ خراٹا ہی ایک موسیقی تھی، جسے گاندھرو کی بیوی سمجھ پائی تھی۔
بیوی کے چلے جانے کے بعد گاندھرو داس کو بیوی کی توسب زیادتیاں بھول گئیں۔ لیکن اپنے اُس پر کیے ہوئے اتیاچار یاد رہ گئے۔ وہ بیچ رات کے ایکا ایکی اُٹھ جاتا اور گریبان پھاڑ کر ادِھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ بیوی کے بارے میں آخری خواب میں اس نے دیکھا کہ دوسری عورت، کو دیکھتے ہی اس کی بیوی نے واویلا مچا دیا ہے اور روتی چلاتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلی ہے۔ گاندھرو داس پیچھے دوڑا۔ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے کچّی زمین میں دیمنتی نے اپنے آپ کو دفن کر لیا۔ مگر مٹّی ہل رہی تھی اور اس میں دراڑیں سی چلی آئی تھیں، جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہے۔ حواس باختگی میں گاندھرو داس نے اپنی عورت کو مٹّی کے نیچے سے نکالا تو دیکھا —— اس کے، بیوی کے دونوں بازو غائب تھے۔ ناف سے نیچے بدن نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ اپنے ٹھنٹ اپنے پتی کے گرد ڈالے اس سے چمٹ گئی اور گاندھرو اُسی پُتلے سے پیار کرتا ہوا اُسے سیڑھیوں سے اوپر لے آیا۔

گاندھرو داس کا گانا بند ہو گیا!

گاندھرو داس کے تین بچّے تھے —— تھے کیا —— ہیں۔ سب سے بڑا ایک نامی پلے بیک سنگر ہے، جس کے لانگ پلیئنگ ریکارڈ بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ایرانی ریستورانوں میں رکھے ہوئے جیوک باکسوں سے جتنی فرمائشیں اس کے گانوں کی ہوتی ہیں اور کسی کی نہیں۔ اس کے برعکس گاندھرو داس کے کلاسیکی میوزک کو کوئی گھاس

بھی نہ ڈالتا تھا۔ دوسرا لڑکا آفسیٹ پرنٹر ہے اور جست کی پلیٹیں بھی بناتا ہے۔ پریس سے وہ ڈیڑھ ہزار روپیا مہینا پاتا ہے اور اپنی اطالوی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کوئی جیے یا مرے اسے اس بات کا خیال ہی نہیں۔ جس زمانے میں گاندھرو داس کا موسیقی کے ساز بیچنے کا کام ٹھپ ہوا تو بیٹا بھی ساتھ تھا۔ گاندھرو نے کہا — چلو، ایچ۔ایم۔وی کے ریکارڈوں کی ایجنسی لیتے ہیں۔ چھوٹے نے جواب دیا — ہاں، مگر آپ کے ساتھ میرا کیا مستقبل ہے؟ گاندھرو داس کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹے کا مستقبل کیا بتا سکتا تھا؟ کوئی کسی کا مستقبل کیا بتا سکتا ہے؟ گاندھرو کا مطلب تھا کہ میں کھاتا ہوں تو تم بھی کھاؤ۔ میں بھوکا مرتا ہوں تو تم بھی مرو۔ تم جوان ہو، تم میں حالات سے لڑنے کی طاقت زیادہ ہے۔ اس کے جواب کے بعد گاندھرو داس ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ رہی بیٹی تو وہ ایک اچھے مارواڑی گھر میں بیاہی گئی۔ جب وہ تینوں بہن بھائی ملتے تو اپنے باپ کو رنڈوا نہیں، مرد بدھوا کہتے اور اپنی اس اختراع پہ خود ہی ہنسنے لگتے۔

ایسا کیوں؟

چاترک، ایک شاعر اور اکاؤنٹنٹ جو اس اشتہار کے سلسلے میں گاندھرو داس کے ہاں گیا تھا، کہہ رہا تھا — اس بڈھے میں ضرور کوئی خرابی ہے — ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین اولادوں میں سے ایک بھی اس کی دیکھ ریکھ نہ کرے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے کہ دور ہو گئے؟ ہندسوں میں الجھے رہنے کی وجہ سے کہیں چاترک کے الہام اور الفاظ کے درمیان فساد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ہندستان تو کیا

دنیا بھر میں کنبے کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بڑوں کا ادب ایک فیوڈل بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لیے سب بڈھے کسی ہائیڈ پارک میں بیٹھے، امتداد زمانہ کی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے، ہر آنے جانے والے کو شکار کرتے ہیں، کہ شاید اُن سے کوئی بات کرے۔ وہ یہودی ہیں، جنھیں کوئی ہٹلر ایک ایک کر کے گیس چیمبر میں دھکیلتا جا رہا ہے مگر دھکیلنے سے پہلے زنبور کے ساتھ اس کے دانت نکال لیتا ہے، جن پر سونا مڑھا ہے۔ اگر کوئی بچ گیا ہے تو کوئی بھانجا بھتیجا اتفاقیہ طور پر اُس بڈھے کو دیکھنے کے لیے اس کے مخروطی ایٹک میں پہنچ جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ تو مرا پڑا ہے اور اس کی قلزاقی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہیں۔ نیچے کی منزل والے بہ دستور اپنا اخبار بیچنے کا کاروبار کر رہے ہیں، کیوں کہ دنیا میں روز کوئی نہ کوئی واقعہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر آ کر تصدیق کرتا ہے کہ بڈھے کو مرے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ صرف سردی کی وجہ سے لاش گلی سڑی نہیں۔ پھر وہ بھانجا یا بھتیجا کمیٹی کو خبر کر کے منظر سے ٹل جاتا ہے، مبادا آخری رسوم کے اخراجات اسے دینے پڑیں۔

جاترک نے کہا ـــــ ہو سکتا ہے، بڈھے نے کوئی اندوختہ رکھنے کے بجائے اپنا سب کچھ بچّوں ہی پر لٹا دیا ہو۔ اندوختہ ہی ایک بولی ہے جسے دنیا کے لوگ سمجھتے ہیں اور ان سے زیادہ اپنے سگے سمبندھی، اپنے ہی بچے بالے۔ کوئی سنگیت میں تارے توڑ لائے، نقاشی میں کمال دکھا جائے، اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر اولاد ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا باپ وہی کرے جس سے وہ، اولاد خوش ہو۔ باپ کی خوشی کس بات میں ہے، اس کی کوئی بات ہی نہیں اور ہمیشہ ناخوش رہنے کے لیے اپنے

کوئی سا بھی بے گانہ بہانہ تراش لیتے ہیں۔

مگر گاندھروداس تو بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ہر وقت لطیفے سناتا، خود ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے لطیفے اکثر فحش ہوتے ہیں۔ شاید وہ کوئی نقاب، مکھوٹے ہیں، جن کے پیچھے وہ اپنی جنسی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کو چھپاتا رہتا ہے۔ یا پھر، سیدھی سی بات — بڑھاپے میں انسان ویسے ہی ٹھرکی ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقی یا مفروضہ فتوحات کی بازگشت!

اشتہار کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ اس لیے بھی بدک گئے کہ گاندھروداس پر پچپن ہزار کا قرض بھی تھا، جو بات اس نے اشتہار میں نہیں لکھی تھی اور غالباً اس کی عیاری کا ثبوت تھی۔ اس پر طرفہ ایک جوان لڑکی سے آشنائی بھی تھی جو عمر میں اس کی اپنی بیٹی رما سے چھوٹی تھی۔ وہ لڑکی، دیویانی، گانا سیکھنا چاہتی تھی جو گوروجی نے دن رات ایک کر کے اسے سکھا دیا اور سنگیت کی دنیا کے شکھر پر پہنچا دیا۔ لیکن ان کی عمروں کے بُعد کے باوجود ان کے تعلقات میں جو ہیجانی کیفیت تھی، اسے دوسرے تو ایک طرف، خود وہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ اب بھلا ایسے چاروں عیب شرعی باپ کو کون خریدے؟

اور پھر — جو ہر وقت کھانستا رہے، کسی وقت بھی دم الٹ جائے اس کا۔

باہر جائے تو نوٹا نک مار کے آئے۔ بلکہ لوٹتے وقت پوّا بھی دھوتی میں چھپا کر لے آئے۔

آخر — دمے کے مریض کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے!

گاندھرو داس سنگیت سکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ اٹھتا ــ میں پھر گاؤں گا۔ وہ تکرار کے ساتھ یہ بات شاید اس لیے بھی کہتا کہ اسے خود بھی اس میں یقین نہ تھا۔ وہ سُر لگاتا بھی تو اسے اپنے سامنے اپنی مرحوم بیوی کی روح دکھائی دیتی ــ جیسے کہہ رہی ہو ــ ابھی تک گا رہے ہو؟

اس انوکھے مطابے اور امتزاج کی وجہ سے لوگ گاندھرو داس کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت چمکتی، دمکتی ہوئی شے ہو اور جس کا نقش وہاں سے ٹل جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک آنکھ کے اندر پردے پر برقرار رہے اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے جب تک کوئی دوسرا عنصری نظارہ پہلے کو دھندلا نہ دے۔

کسی خورشید عالم نے کہا ــ میں خریدنے کو تیار ہوں بہ شرطے کہ آپ مسلمان ہو جائیں۔

مسلمان تو میں ہوں ہی

کیسے؟

میرا ایمان خدا پہ مُسلّم ہے۔ پھر، میں نے جو پایا ہے، استاد علاءالدین کے گھرانے سے پایا ہے۔

آں ہاں ــ وہ مسلمان ــ کلمے والا . . .

کلمہ تو سانس ہے انسان کی جو اس کے اندر، باہر جاری اور ساری ہے۔ میرا دین سنگیت ہے۔ کیا استاد عبدالکریم خاں کا باہری داس ہونا ضروری تھا؟

پھر میاں خورشید عالم کا پتا نہیں چلا۔

دو تین عورتیں بھی آئیں۔ لیکن گاندھرو داس جس نے زندگی کو

نوشانک بنا کے پی لیا تھا، بولا — جو تم کہتی ہو عین مین اس سے اُلٹ چاہتی ہو۔ کوئی نیا تجربہ جس سے بدن سو جائے اور روح جاگ اُٹھے، اسے کرنے کی تم میں ہمت ہی نہیں۔ دین، دھرم، معاشرہ نہ جانے کن کن چیزوں کی آڑ لیتی ہو، لیکن بدن رُوح کو شکنجے میں کس کے یوں سامنے پھینک دیتا ہے۔ تم پلنگ کے نیچے کے مرد سے ڈرتی ہو اور اسے ہی چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دماغ میں عفت ہی کی رٹ سے اپنی عصمت لٹواتی ہو اور وہ بھی بے مہار . . . اور پھر گاندھرو داس نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا — دراصل تمھارے بچے ہی غلط ہیں !

ان عورتوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ازلی مائیں دراصل باپ نہیں، کسی خدا کے بیٹے کی تلاش میں ہیں۔ ورنہ تین تین چار چار تو ان کے اپنے بیٹے ہیں، مجاز کی اس دنیا میں . . . .

میں اُس دن کی بات کرتا ہوں، جس دن بان گنگا کے مندر سے بھگوان کی مورتی چوری ہوئی۔ اُس دن پت جھڑ بہار پر تھی۔ مندر کا پورا احاطہ سوکھے سڑے، بوڑھے پتوں سے بھر گیا۔ کہیں شام کو بارش کا ایک چھینٹا پڑا اور چوری سے پہلے مندر کی جیوتیوں پہ پروانوں نے اتنی ہی فراوانی سے قربانی دی، جس فراوانی سے قدرت انھیں پیدا کرتی اور پھر ان کی کھاد بناتی ہے۔ یہ وہی دن تھا، جس دن پجاری نے پہلے بھگوان کرشن کی رادھا (جو عمر میں اپنے عاشق سے بڑی تھی) کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر مہترانی چھیتو کی طرف (جو عمر میں پجاری کی بیٹی سے چھوٹی تھی) اور وہ پتے اور پھول اور بیج گھرے گئے۔

مورتی تو خیر کسی نے سونے چاندی، ہیرے اور پنّوں کی وجہ سے

چرائی، لیکن گاندھرو داس کو لارسن اینڈ لارسن کے مالک ڈروے نے بے وجہ، خرید لیا۔ گاندھرو داس اور ڈروے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ بوڑھے نے صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کہہ دیا ــ جیسے تیسے بھی ہو، مجھے لے لو بیٹے۔ بنا بیٹے کے کوئی باپ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ڈروے کو آنکھیں ملانے، سوال کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ سوال شرطوں کا تھا، مگر شرطوں کے ساتھ کبھی زندگی جی جائے ہے؟ دروے نے گاندھرو داس کا قرض چکایا، سہارا دے کر اسے اٹھایا اور مالا بارہل کے دامن میں اپنے عالی شان بنگلے گری کنج میں لے گیا۔ جہاں وہ اس کی تیمار داری اور خدمت کرنے لگا۔

دروے سے اس کے ملازموں نے پوچھا ــ سر، آپ یہ کیا مصیبت لے آئے ہیں۔ یہ بڈھا، مطلب، بابو جی آپ کو کیا دیتے ہیں؟ کچھ نہیں۔ بیٹھے رہتے ہیں آلتی پالتی مارے۔ کھانستے رہتے ہیں اور یا پھر زردے قوام والے پان چبائے جاتے ہیں۔ جہاں جی چاہے، تھوک دیتے ہیں، جس کی عادت مجھے اور میری صفائی پسند بیوی کو ابھی نہیں پڑی، مگر پڑ جائے گی ــ دھیرے دھیرے ... مگر تم نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں؟

جی نہیں

جاؤ، دیکھو، ان کی روتی ہنستی آنکھوں میں کیا ہے۔ ان میں سے کیسے کیسے سندیس نکل کر کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟

کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟ ــ جمنا داس ڈروے کے ملازم نے غیر ارادی طور پر فضا میں دیکھتے ہوئے کہا ــ آپ تو سائنس داں ہیں!

میں سائنس ہی کی بات کر رہا ہوں، جمنا! اگر انسان کے زندہ رہنے کے لیے پھل پھول اور پیڑ پودے ضروری ہیں، جنگل کے جانور ضروری ہیں بچے ضروری ہیں تو بوڑھے بھی ضروری ہیں۔ ورنہ ہمارا ایکولاجیکل بیلنس تباہ ہو کر رہ جائے۔ اگر جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر بے وزن ہو کر انسانی نسل ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔

جمنا داس اور اتھاوے بھاؤ کچھ سمجھ نہ سکے۔

دُروے نے بنگلے میں لگے اشوک پیڑ کا ایک پتا توڑا اور جمنا داس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ــــ اپنی پوری سائنس سے کہو کہ یہ تازگی، یہ شگفتگی، یہ شادابی اور یہ رنگ پیدا کر کے دکھائے.....

اتھاوے بولا ــــ وہ تو اشوک کا بیج بوئیں.....

آں ہاں ــــ دُروے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں بیج کی نہیں، پتے کی بات کر رہا ہوں۔ بیج کی بات کریں گے تو ہم خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔

پھر جمنا داس کے قریب ہوتے ہوئے دُروے بولے ــــ میں تمھیں کیا بتاؤں، جمنا! جب میں بابوجی کے چرن چھو کر جاتا ہوں تو ان کی نگاہوں کا مرم مجھے کتنی شانتی، کتنی ٹھنڈک دیتا ہے، میں جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپتا رہتا تھا، اب نہیں کانپتا۔ مجھے ہر وقت اس بات کی تسلی رہتی ہے ــــ وہ تو ہیں۔ مجھے یقین ہے، بابوجی کی آتما کو بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا!

میں نہیں مانتا، سر ــــ یہ خالی خولی جذباتیت ہے۔

ہو سکتا تھا، دُروے بھڑک اٹھتا ــ ہو سکتا تھا وہ جمنا داس،

اپنے ملازم کو اپنی فرم سے ڈسمس کر دیتا۔ لیکن باپ کی آنکھوں کے مَرم نے اُسے یہ نہ کرنے دیا۔ اُلٹا اس کی آواز میں کہیں سے کوئی کومل سُر چلا آیا اور اس نے بڑے پیار سے کہا —— تم کچھ بھی کہہ لو، جمنا — پر ایک، بات تو تم جانتے ہو۔ میں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے سلامیں کرتے ہیں۔ میرے سامنے سر جُھکاتے، بچھ بچھ جاتے ہیں۔

دُروے اس کے بعد ایکا ایکی چُپ ہو گیا۔ اُس کا گلا اور اس کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔

سر، میں بھی تو یہی کہتا ہوں — دنیا آپ کے سامنے سر جُھکاتی ہے! اسی لیے . . . دُروے نے اپنی آواز پاتے ہوئے کہا —— کہیں میں بھی اپنا سر جھکانا چاہتا ہوں۔ اچھا و لے، جمنا داس، اب تم جاؤ، پلیز! میری پوجا میں وِگھن نہ ڈالو۔ ہم نے پتھر سے بھی خدا پایا ہے۔

گری کنج میں لگے ہوئے آم کے پیڑوں پر بور آیا۔ اِدھر پہلی کوئل کوکی، اُدھر گاندھرو داس نے برسوں کے بعد تان اُڑائی — کوئیلیا بولے امبوا کی ڈار . . . .

وہ گانے لگے۔ کسی نے کہا — آپ کا بیٹا آپ سے اچھا گاتا ہے۔ ایسا؟ . . . گاندھرو داس نے بمبیا بولی میں کہا — آخر میرا بیٹا ہے۔ باپ نے میٹرک کیا ہے تو بیٹا ایم۔ اے نہ کرے؟

ایسی باتیں کرتے ہوئے ناسمجھ، بے باپ کے لوگ گاندھرو داس کے چہرے کی طرف دیکھتے کہ اُن کی جُھرّیوں میں کہیں تو جلن دکھائی دے۔ جب کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تو کسی نے لقمہ دیا — آپ کا بیٹا کہتا ہے،

میرا باپ مجھ سے جلتا ہے۔

سچ؟ — میرا بیٹا کہتا ہے —

ہاں، میں جھوٹ تھوڑے بول رہا ہوں۔

گاندھرو داس تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جیسے وہ کہیں اندر عالمِ ارواح میں چلے گئے ہوں اور ماں سے بیٹے کی شکایت کی ہو — بڑھیا سے کوئی جواب پاکر وہ دھیرے سے بولے — اور تو کوئی بات نہیں، میرا بیٹا — وہ بھی باپ ہے۔ ۔ ۔ وہ پھر اُن دنوں کی طرف لوٹ گئے جب بیٹے نے کہا تھا — بابوجی، میں بھی شاستریہ سنگیت میں آپ جیسا کمال پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈھیر سارا روپیا کما کر اور بابوجی نے بڑی شفقت سے بیٹے کے کندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ایسے نہیں ہوتا، راجو۔ ۔ ۔ یا آدمی کمال حاصل کرتا ہے یا پیسے ہی بناتا چلا جاتا ہے۔ جب دو بڑے بڑے آنسو لڑھک کر گاندھرو داس کی داڑھی میں اٹک گئے، جہاں دُروے بیٹھا تھا، اُدھر سے روشنی میں وہ پرزم ہو گئے، سفید روشنی جن میں سے نکل کر سات رنگوں میں بکھر گئی۔ ۔ ۔

دروے کو نہ جانے کیا ہوا۔ وہ اُٹھ کر زور سے چلایا — گیٹ آؤٹ۔ ۔ ۔ ۔ اور لوگ چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے بھاگے۔

گاندھرو داس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور صرف اتنا کہا — نہیں۔ بیٹے، نہیں —

ان کے ہاتھ سے کوئی برقی رویں نکل رہی تھیں۔

ڈُروے جب لارسن اینڈ لارسن میں گیا تو فلپ، اس کا ورکس منیجر کمپیوٹر کو ڈیٹا فیڈ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر سے کارڈ باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا اور کارڈ کی طرف دیکھ رہا تھا.......

لارسن اینڈ لارسن کو اکتالیس لاکھ کا گھاٹا پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں اُس نے کارڈ ڈُروے کے سامنے کر دیا، جسے دیکھ کر اُس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ ڈُروے نے صرف اتنا کہا — کوئی انفارمیشن غلط فیڈ ہو گئی ہے۔

نہیں سر... میں نے بیسیوں بار چیک، کراس چیک کر کے اسے فیڈ کیا ہے۔

تو پھر.. مشین ہے۔ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو گا۔ آئی۔ بی۔ ایم والوں کو بلاؤ۔

مووک — چیف انجینیر تو ساؤتھ گیا ہے۔

ساؤتھ کہاں؟

تروپتی کے مندر... سُنا ہے اُس نے اپنے لمبے، ہپی بال کٹوا کر مورتی کی نذر کر دیے ہیں!

ڈُروے ہلکا سا مسکرایا اور بولا — تم نے یہ انفارمیشن فیڈ کی ہے کہ ہمارے بیچ ایک باپ چلا آیا ہے؟

فلپ نے سمجھا، ڈُروے اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں، یا ویسے ہی اُن کا دماغ پھر گیا ہے۔ مگر ڈُروے کہتا رہا — اب ہمارے سر پہ کسی کا ہاتھ ہے، تبریک ہے اور اُس کے نتیجے کا حوصلہ اور ہمت... مت بھولو، یہ مشین کسی انسان نے بنائی ہے، جس کا کوئی باپ تھا، پھر اُس کا باپ... اور آخر سب کا باپ — جہلِ مرکب یا مفرد!

فلپ نے اپنی اندرونی خفگی کا منہ موڑ دیا — کیا دیویانی اب بھی بابوجی کے پاس آتی ہے ؟

ہاں۔

مسز دروے کچھ نہیں کہتیں ؟

پہلے کہتی تھیں۔ اب وہ اُن کی پوجا کرتی ہیں۔ بابوجی دراصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں فلپ... معلوم ہوتا ہے انھوں نے کہیں پرکرتی کے چِتون دیکھ لیے ہیں، جن کے جواب میں وہ مسکراتے تو ہیں، لیکن کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں۔

فلپ کا غصّہ اور بڑھ گیا۔

دُروے کہتا گیا — بابوجی کو شبد — بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للّی، میا بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار سے اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی میں قید۔

دیویانی ؟

دُروے نے حقارت سے کہا — تم سیکس کو اتنی ہی اہمیت دو، فلپ، جتنی کا کہ وہ مستحق ہے۔ تیتر بٹیر بنے بغیر اسے حواس پہ مت چھانے دو... سنگیت شاید ایک آڑھتی دیویانی کے لیے...

میں سمجھا نہیں سر ؟

بابوجی نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی بچپن ہی میں آوارہ ہو گئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو کچھ اس عالم میں دیکھ لیا، جب کہ وہ نوخیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی اپنی ماں ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ گھبرا کر ایک مرد سے دوسرے دوسرے

سے تیسرے کے پاس جانے لگی۔ اس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مگر روح تھی کہ تھکتی ہی نہ تھی۔

کیا مطلب؟

دیویانی کو دراصل باپ ہی کی تلاش تھی۔

فلپ جو ایک کیتھولک تھا، ایک دم بھڑک اُٹھا۔ اس کے ابرو بالشت بھر اوپر اٹھ گئے۔ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے نار جہنم لپکنے لگی۔ اُس نے چلّا کر کہا — یہ فراڈ ہے، مسٹر دُروے، پیور، اَن اڈلٹریٹیڈ فراڈ...

جبھی دُروے نے اپنے خریدے ہوئے باپ کی نم آنکھوں کو ورثے میں لیے، کمپیوٹر کے پس منظر میں کھڑے فلپ کی طرف دیکھا اور کہا — آج ہی بابوجی نے کہا تھا، فلپ! تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو اسے۔

چشمۂ بد دُور

یہ واقعہ بھی سنیچر ہی کے روز ہوا۔

تم کہو گے کہ تمھارے ساتھ سب واقعات سنیچر ہی کو کیوں ہوتے ہیں؟ تو بولو میں کیا جواب دوں۔ یہی کہہ سکتا ہوں نا، کہ ہفتہ کے باقی دنوں میں تو میں واقعات کو ہوتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

بات سیدھی ہے، باقر بھائی، سنیچر کے دن میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ایک دن پہلے کوئی چھٹی نہیں ہوتی (ہاں، سال میں ایک دن ہوتی ہے۔ البتہ گڈ فرائی ڈے والے دن لیکن چند لوگوں کی بدقسمتی سے بعض اوقات گڈ فرائی ڈے بھی اتوار کو آپڑتا ہے اور ان کی تعطیل ماری جاتی ہے!) لیکن سنیچر کے روز کوئی ایسی قباحت نہیں ہوتی۔ ایسی سکتہ بند چھٹی آتی ہے کہ آدمی سب کی چھٹی بُلا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سنیچر سے ایک دن پہلے اُسے جمعہ کی نماز پڑھنی پڑی تھی۔ نماز تو خیر فرض ہے، اتوار کو بھی لیکن

تم سچ بتاؤ، باقر بھائی، اپنی سلمیٰ کی قسم کھاؤ۔ کیا اتوار کو تمھاری نمازیں قضا نہیں ہوتیں!

یہ سب باتیں تم سے میں اوپن اس لیے کہہ رہا ہوں، کہ تو دہریا ہے، اگرچہ سیدزادہ ہے۔ میں نے سب مذہبوں میں دیکھا ہے کہ جو لوگ بانیٔ مذہب کی براہِ راست یا چَپ اولاد ہوتے ہیں، وہی مذہب اور اُس کے قوانین کو کم مانتے ہیں۔ ایک دن تم ہی کہہ رہے تھے نا؟— گئے تھے روزے بخشوانے، اُلٹی نماز گلے پڑی، کہا نہیں تھا تم نے؟ دیکھ — اب جھوٹ مت بول، مت کُفر تول...

سنیچر کی صبح کو البتہ کائنات کے نمبر دو (پیسے نہیں) ستارے جسے تم زُحل اور ہم ہندو لوگ سنیچر کہتے ہیں، کو تھوڑا رشوت دینی پڑتی ہے، اور بس۔ اور وہ رشوت بھی آج کل کی رشوت کے مقابلے میں کیا ہے؟ اس سے سو گنا زیادہ تو دہلی کے ایکا ایکی کے سفر میں ریلوے کا کنڈکٹر گارڈ لے جاتا ہے۔ پولیس کی تو بات ہی چھوڑ دو۔ تمھارا حادثہ ہوا، چوٹ بھی لگی، گاڑی بھی ٹوٹی اور جب تھانے میں رپٹ دینے کے لیے گئے تو محرّر یا ڈیوٹی افسر کیا "سیاں دھیرے سے، سیاں چُپکے سے" کے انداز میں دراز آپ کے سامنے کھول دیتا ہے۔

سنیچر کے دن رشوت صرف اتنی ہے کہ بس مندر جاؤ جس کے بغل میں ایک دُکان ہوگی، ہمیشہ ہوگی، جہاں سے تیل، ناریل، ہار وغیرہ مل جائیں گے۔ وہاں سرسوں کے تیل کی ایک پلی خریدو۔ سرسوں کا نہ ملے تو کھوپرے ہی کا چلے گا، جو پچیس ۲۵ پیسے میں مل جائے گا۔ تیل ڈالنے کے لیے لوہے کی کٹوری تیل والا خود ہی دے گا اور اُس کے لیے کوئی الگ دام نہیں لے گا۔ کیوں کہ

مُورتی پہ چڑھاوا ہو جانے کے بعد وہ کٹوری اپنے آپ تیل والے کے پاس چلی آئے گی، مع تیل کے۔ اگر تیل والا اور پانڈے جی آپس میں ملے ہوئے ہیں اور پتّی رکھے بیٹھے ہیں تو ہمیں اس سے کیا؟ ہم تو انجلی کر چکے ہیں۔ تیل والا شروع ہی میں، جو آپ کو چند بوندیں کم دے گا، اسے ہی کٹوری کا کرایہ سمجھو۔ مندر میں ایک دن میں ہزاروں لوگ آتے ہیں تو ایک ایک بوند کر کے کئی بوندیں ہوئیں؟ تم ایک بوند کو کم سمجھتے ہو؟ اگر وہ کم ہوتی تو شیخ سعدی کبھی نہ کہتے۔ اے کہ تو یک قطرۂ آبی۔۔۔

تو، لوہے کی کٹوری میں تیل، تیل میں چند دانے ماش کے اور ایک پیسا تانبے کا، پہلے تو یہی ہوتا تھا، لیکن آج کل تو تانبا رہا ہے نہ پیسا۔ پیسے کی جگہ پانچ دس پیسے نے لے لی ہے اور تانبے کی جگہ نکل نے، جو کسی نہ کسی طرح سے تمھاری جیب سے نکل ہی آئے گا۔ یہ سب لے کے چلو، کیونکہ دیوتا لوگ بھی موقع شناس اور معاملہ فہم ہو گئے ہیں اور حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا سیکھ گئے ہیں۔ وہ اُنھیں بھی گریہ پیشانی سے قبول کر لیں گے۔

بات یہ ہے، باقرے— سنیچر کا تعلق ہر کالی چیز سے ہوتا ہے، جس کا دان واجب ہے۔ مثلاً لوہا، ماش، کالا کپڑا، چھتری، نمبر دو کا پیسا، تمھارا دل، قلم۔ لیکن دان کے سلسلے میں تم لوہے کی کٹوری، میں تیل تک ہی رہو۔ بہت وہ نہ اُڑو۔ ہاں جو کام پچیس پیسے میں ہو جائے، اُس کے لیے لاکھوں کا کیا سوچنا؟ تیل کی پلی میں اپنا منہ دیکھتے ہوئے مندر کو دھاؤ اور جاتے میں صرف تیل ہی میں دیکھو، تمھیں اس میں اپنا چہرہ اپنے باپ کا دکھائی دے گا، جس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ ٹھاکر دوارے پہنچو تو جوتا اُتار دو۔ اتار لو میں نے کب کہا ہے! آخر دہریے

ہونا؟ جوتا مندر سے باہر بیٹھی ہوئی عورت کی تحویل میں دے دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ تم عورت کو جانتے ہی ہونا۔ اگر تم جوتا اُس کے ہاتھ میں نہیں دوگے تو وہ خود لے لے گی، جوتے کے بعد مندر میں جاؤ اور باہر کا سب بھول جاؤ۔ مورتی کے سامنے سر نہوڑاؤ تو کسی عورت کا خیال دل میں نہ لاؤ، چاہے وہ اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کوئی جاپ کسی اسم اعظم کا ورد کرو۔ اگر یاد نہیں تو نہ سہی۔ کوئی ایسی بات دل میں دہراؤ، جس میں کم سے کم وزن یا ترنم تو ہو۔ ایک بات تمھیں بتا دوں کہ سب دیوی دیوتا، پیر پیغمبر گد یعنی نثر کے بہت خلاف ہیں۔ اس لیے کچھ بھی یاد نہ آئے تو یہی کہتے جاؤ۔ لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے، لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے .... یہ تمھیں ریل گاڑی کی آواز معلوم ہوتی ہے نا؟ ریل گاڑی ہمیشہ وہی کہتی ہے، جو تم کہتے ہو۔ ایسے ہی بھگوان بھی وہی کہتا ہے جو تم کہتے ہو۔ اُس کے کوش یا لغت میں ہر بات کا ایک ہی مطلب ہے — ہمہ اوست ... لالہ موسیٰ نہیں پڑھ سکتے تو دیوی کی پرکرما ہی کرو۔ وہ سالا — رتن سنگھ کہتا ہے، پرکرما سے میں تھک جاتا ہوں۔ ابے — بھتیجے، خارپشت کی اولاد، تو جو دن میں بیس چکر اُس رانڈ مالا کے کاٹتا ہے تو کیا تین بھگوان کے گرد نہیں کاٹ سکتا؟

مندر سے باہر آؤ گے تو پہلا بردان سنیچر کا یہ ملے گا کہ اوپر تمھارے اینگل سے تمھیں جوتی رکھنے والی کے دودھ دکھائی دیں گے، جن میں کوئی دودھ نہیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ چاہے تمھاری جیب میں پیسا بھی نہ ہو، مگر بے شمار بچے تمھیں گھیر لیں گے — اور پکاریں گے، سیٹھ، او سیٹھ ... بس دنیا میں جس کو عورت اور پیسا مل گئے، اُسے اور

کیا چاہیے؛

معاف کرنا باقر بھیّا، میں بات ذرا لمبی اور گھما پھرا کے کرتا ہوں۔ پروموشن رُک جانے سے میرا دماغ گھوم گیا نا۔ تمھارا جب اور جہاں جی چاہے، ٹوک دینا۔ جن تنتر میں آدمی کو یہی تو حق ہے کہ جھوٹ کو وہ چاہے نہ روکے، مگر سچ کو ضرور ٹوکے . . .

بات میں سنیچر کی کر رہا تھا۔ لیکن فی زمانہ ایک بات اور دوسری میں ربط رکھنا بڑا کٹھن ہو گیا ہے۔ ہمارے سب شاعر اور ادیب اِس کے گواہ ہیں پر وہ بھی کیا کریں۔ منہگائی بھی تو کتنی بڑھ گئی ؟ قدروں میں اتھل پتھل ہو گیا۔ ربط تو گیا ہی تھا، ساتھ ضبط بھی گیا۔ معلوم ہوتا ہے، سمے نے ریسرپن کا ٹیکہ لگا دیا اور دماغ کا وہ حصہ ہی ماؤف ہو گیا جو بتاتا ہے کہ پہلے آپ یہ بات کر رہے تھے اور اب یہ کر رہے ہیں۔ انگریزی محاورے میں گفتگو کا تاگہ کچھ یوں ٹوٹتا ہے کہ جڑتا ہی نہیں۔ جوڑ میں تو صاف گانٹھ دکھائی دیتی ہے۔ اب تو زندگی تصوّر کے سائبیریا میں، کسی لیبر کیمپ میں گزارو۔ پھر کھانا پینا۔ اب اِس ناسپتی کو کھا کر کوئی کسی بدکار یا سرکار سے کیا لڑے گا، جو بازار میں ملتا ہی نہیں! چھوڑو سب —

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

کیسا رہا شعر؟ میں نے اسے ایک ٹرک کے پیچھے لکھا ہوا پڑھا تھا! دراصل شعر اپنے آپ میں اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ اُس کا برمحل استعمال ہی اصلی بات ہے۔ یہ گُر میں نے مولانا آزاد کے دیوان ”غبارِ خاطر“ سے سیکھا

ہے، باقر بھیّا!

تم نے اُس دن کہا تھا کہ رہنے والے ہو تم کیرل کے، نام ہے تمھارا رامن، پھر اتنی اچھی اُردو تمھیں کیسے آتی ہے؟ بات یہ ہے کہ تعلیم میں نے عثمانیہ میں پائی۔ وہ تو میری ماں کے مرجانے اور آخر باپ کے ڈر جانے سے بند ہو گئی۔ لیکن پارٹی ٹائم میں ڈیٹ پہ میں نے اُردو اور ایک حد تک فارسی میں خاصی مدرشد حاصل کرلی۔ کہیں پُو ا پڑھ جاتا، باقر میاں، تو میں بھی آج کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا اور لڑکے لڑکیوں کا گھیراؤ کرتا۔ اب میں بالکل عوام میں سے ہوکر رہ گیا ہوں، جو مجھے آم کی جمع معلوم ہوتے ہیں یوں مجھے عوامی انداز ہی کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ غالب اور میر کی شاعری بالکل پسند نہیں۔ ہاں، کون دماغی کسرت کرے؟

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

اب تم ہی انصاف کرو کہ اگر ہم ہندستانی آدھی درجن اضافتوں کے متحمل ہو سکتے ہیں تو پھر سرکار کے خلاف ہمیں کیا وہ ہے؟ اور سنو —

شیون میں شب کے لوٹی ہے زنجیر، میر صاحب بولو —

میں تو اسے عوامی بنانے اور لطف اٹھانے کے سلسلے میں میر صاحب کی جگہ میم صاحب پڑھ لیتا ہوں۔ اب بتاؤ، میر کے کلام میں معنی پیدا ہوئے یا نہیں؟ عثمانیہ میں جب ہم غالب کا شعر پڑھتے تھے

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا کھُل گئی ہیچمدانی میری

تو بہت حیران اور پریشان ہوتے تھے کہ دہن اُس کا نہ معلوم ہوا، پھر اُن کی ہیچمدانی کیوں کھُل گئی؟

تم ہی بتاؤ۔ اچھی بھلی روزمرہ میں فارسی ہیچمدانی کو گھسیٹنا کہاں

کی شاعری ہے؟ ہاں۔ اگر تم دھوتی پہ کوٹ اور نکٹائی پہننا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی۔ میں سنیچر کی بات سے ذرا پرے ہٹ گیا ہوں، لیکن آرہا ہوں، اس کی طرف ———— یہ چشمہ میرا دیکھ رہے ہو نا؟ اس میں ڈبل کنوکیس کے شیشے لگے ہیں۔ عام آدمی ان میں سے دیکھے تو چیونٹی بھی اسے ہاتھی لگے گی۔ شاید اسی لیے میں روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہوں کیونکہ روسیوں کو ہر چیز اپنے اصل سے سو گنا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ عوام دنیا بھر کے عوام کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن عوام کی اتنی گردان کی ہے کہ وہ خواص ہو گئے ہیں۔ تم دیکھنا اگلے پچاس برس کے اندر جو انقلاب آئے گا، وہ خواص ہی کا ہوگا۔ جس کی نیو سب انقلابوں کی ماں فرانس میں سارتر اور ساربون کے طلبہ نے رکھ بھی دی ہے ۔ ۔ ۔

میری یہ باتیں کونسلیٹ میں نہ کہنا اور نہ یہ بتانا کہ میں سنیچر، راہو اور کیتو کی باتیں کرتا ہوں۔ نہیں میری چھٹی ہو جائے گی، دھرم سے، روسیوں کا یہ ہے نا کہ وہ کہتے نہیں۔ کرتے ہیں!

روسی محنتی بہت ہیں۔ اُن کے دفتر میں جو کام کرتا ہے، اُس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ہندستانیوں میں خون ہے ہی نہیں۔ ہے تو اُن کے گروپ کا نہیں۔ شاید اُن کو پتا چل گیا ہے کہ ہر ہندستانی فطرتاً کام چور واقع ہوا ہے۔ اُس کا بس چلے، بے کار میں بیگار ملے تو کبھی کام نہ کرے۔ مغرب میں ہر آدمی کی تمنا کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک مصروف رہے۔ لیکن ہندستانی یہی سوچتا رہتا ہے کہ کب وہ ریٹائر ہوگا اور کام کے جھنجھٹ سے چھوٹے گا۔ بات وہ پانچ سال بعد کی کر رہا ہے، لیکن ٹانگیں ابھی سے پسارنا شروع

کر دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو میں بتاؤں۔ ہندستانی دراصل کام ملنے سے پہلے ہی ریٹائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کی آب و ہوا نہیں، بلکہ اُس کے کرم و عمل کا وہ فلسفہ ہے، جس پہ ضرورت سے زیادہ ہی زور دینے سے وہ بےعمل ہو گیا ہے۔

نہ تھیسس کر بلند اتنا کہ —— ہر تقریر سے پہلے، اینٹی تھیسس تھیں آلے۔۔۔ ایک بات ہے، باقر بھائی، کہ انسان آخر انسان ہے۔ روس اور امریکہ تو کیا، چاہے وہ ہندستان ہی کا کیوں نہ ہو۔ اسٹیک اور شاشلیک کی جگہ اڈلی دوسا، مونگ کی دال، مرغ مسلّم یا کڑاہ پرشاد ہی کیوں نہ کھاتا ہو، مگر زندگی کی ہر اچھی چیز اُسے بھی اچھی لگتی ہے —— سنیچر کو مندر سے لوٹنے کے بعد میں نے انڈین ایکسپریس میں پڑھا کہ 'لٹل ہٹ' ریستوران میں آج مریانا ناچ رہی ہے۔ مریانا ناچتے وقت اپنے بدن پر کہیں صرف انجیر کا پتّہ پہنتی ہے۔ ہاں بھائی، لوگ اسے بھی پہننا ہی کہتے ہیں۔ پھر سامنے اپنے دُودھ پہ وہ مسمریزم کے دو نقطے سے پینٹ کر لیتی ہے حالانکہ ہماری عورتیں تو کپاس کا کھیت کا کھیت اپنے بدن پر اُگا لیتی ہیں!

میرے ایک دوست، ارے، تم ہی تو تھے، باقر، جس نے بتایا تھا کہ مریانا کا رنگ گورا ہے نہ کالا۔ بس عشق والا ہے۔ اُس کا باپ لبنانی ہے اور ماں عراقی اور یہ سب کچھ مل کر لوگوں کو مراقی بنا دیتا ہے۔ وہ زیتون کے تیل کی مالش سے اپنے بدن کو اتنا لچک دار بنا لیتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، اُوپر کے حصّے کا نیچے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ جیسے ہماری ٹرالی بسیں ہوتی ہیں نا جس میں ٹرالی پر ڈرائیور ہوتا ہے اور پیچھے سواریاں اور ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر الٹ

جاتی ہیں۔ مریانا کو دیکھنے والے بھی تو ایسے ہی اُلٹتے، زخمی ہوتے، مرجاتے ہیں ..... میں نے تمھیں کہا تھا ناکہ عورت کے بارے میں ہر مرد کا ایک فیٹش ـــ خبط ہوتا ہے، چنانچہ میرا خبط اُس کی کمر ہے۔ اور تم جانو باقر بھائی، دنیا کے سب فساد عورت کی کمر سے شروع ہوتے ہیں!

تو سنیچر کی ایک شام کو میں نے ولادی میر، اپنے فوری اوپر کے افسر سے دو گھنٹے کی چھٹی مانگی، لیکن اُس نے اتنے رُباب سے "نیئت" (نہیں) کہا کہ مجھے اس کی نیّت پر شک پیدا ہوگیا۔ ایسی قطعیت صرف روسی ہی کے لہجے میں ہو سکتی ہے۔ اُس کے ساتھ والے میز پر ولادی میر دارناف کا فوری افسر نکولائی کریا ٹکن بیٹھا تھا۔ اب روسی دفتروں میں ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے فوری افسر کے اوپر کے فوری افسر سے بات نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں نے اپنی درخواست کو ولادی میروارناف ہی کے سامنے دہرایا، بیوی کی بیماری کا بہانہ بنایا۔ لیکن وہ جواب میں بولا ـ نہیں، گھنٹہ بھی نہیں۔ مجھے زیادہ بُرا اس لیے نہیں لگا کہ میں جانتا تھا اس کی ہندی میری روسی سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ اس لیے گھونٹ کا خون پی کر رہ گیا۔ یعنی کہ چُپ ہوگیا۔ چپ تو ہم پہلے ہی رہتے تھے، مگر اب اور بھی چپ ہو گئے۔ یہ اور بھی چپ، کیا ہوتا ہے۔ یہ تم نہ جان سکو گے، میری جان، کیونکہ تم دفتر کے بیابان میں کبھی کھوئے ہی نہیں..... عام طور پر دفتر سے چھ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ابھی پورے دس منٹ باقی تھے کہ میں نے انواسٹیس سمیٹنا شروع کر دیں اور ولادی میر کی طرف اس لیے نہیں دیکھا کہ وہ ضرور میری طرف دیکھ رہا ہوگا۔ میرے دماغ میں مریانا کے بارے میں اپنے آپ ایک نظم پل رہی تھی ـ مریانا، او مریانا، تیرے لیے آج ـ مرجانا..... کیسی ہے؟

ارے نہیں باقر بھیّا۔ کہاں پشکن اور کہاں میں؟ لیکن یہ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میری نظم پشکن کی ۱۸۳۱ء میں کہی گئی نظم۔ جب تو میری باہنوں میں ہوتی ہے، سے ملتی ہوئی ضرور معلوم دیتی ہے۔ انیسویں صدی کے شروع اور اس کے آخر تک اُردو کا ادیب تو یہی لکھا کرتا تھا۔ جب تو میرے باہنوں میں ہوتا ہے! کچھ بھی ہو، مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری یہ نظم ایک دم تباہ زادہ ہے اس میں کوئی سرقہ نہیں۔ شعر میں اگر تم مجھے جوش سے ملاؤ تو مجھے بُرا نہیں لگے گا البتہ کیونکہ میں بھی آخر اُنھی کے وزن کا تخلص فرماتا ہوں۔ ہوش! جیسے تیسے بھی میں نے وہ دس منٹ گزارے۔ پھر روسی فراخ دل بھی ہوتا ہے، کیا بتاؤں، باقر، دس منٹ کے بعد مجال ہے جو ولادی میر نے ایک نظر بھی میری طرف پھینکی ہو۔ یا نکولائی کریاٹکن نے ولادی میر وارناف کی طرف!

کچھ دیر میں میں بس پکڑ کر لٹل ہٹ میں پہنچ گیا۔

لٹل ہٹ۔ دراصل ایک بڑے ہوٹل کا حصّہ ہے۔ اس کا نام ہی لٹل ہے، ورنہ اچھی خاصی جگہ ہے اُس میں چیزوں کی وسعت کو آخر پیمانے ہی سے تو نہیں ناپا جاتا۔ ہمارے سامنے اور بھی بہت کچھ ہے۔ دیکھو نا اتنی بڑی کائنات اور پھر اس میں ماں کی گود۔ میکرو کازم میں مائکرو کازم بمبئی شہر کی رونق بڑی ہے یا سلمیٰ کی باہنوں کا سکوت؟ نصیبن کا برقع بڑا ہے یا مریانا کا انجیر کا پتّہ؟ اگر مالکوں نے دیواروں کو خاص رنگ کا اثر دے رکھا تھا، یا اُن پہ ایسے ہی تجریدی چہرے ٹانک رکھے تھے تو محض لوگوں کو بھرمانے کے لیے۔ بعض وقت بدصورتی ارادے سے بھی پیدا کرنی چاہیے تاکہ دوسروں کو اپنا آپ خوبصورت لگے۔ آج کا آرٹ یہی سب تو کرتا ہے۔

لٹل ہٹ، ہر عمر، ہر نوع کے لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس کی وجہ

صرف مریانا کا ناچ، اُس کے بدن کا لوچ اور خوبصورتی ہی نہیں تھی؛ بلکہ وہ خلا بھی جسے پاٹنے کی خواہش شادی کے تیسرے چوتھے سال ہی مرد اور عورت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یا پھر زندگی کی سادہ سی حقیقت کہ کچھ گھوڑے دوڑتے ہی اُس وقت ہیں، جب ساتھ والے دوڑیں۔

کونے میں مجھے ایک سیٹ نظر آئی، جس کے ایک طرف کوئی دُبلا پتلا منحنی سا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ شکل سے لائبریرین معلوم ہوتا تھا۔۔۔ کمال کی بات ہے نا، باقر بھائی، تعارف پر وہ سچ مچ ہی یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس کا اسسٹنٹ لائبریرین نکل آیا۔ تم کہو گے کہ لائبریرین کی کوئی خاص شکل ہوتی ہے؟ تو میں کہوں گا، ہاں۔ اُس کے چہرے ہی پہ کارڈ انڈکس ہوتا ہے۔ جیسے ہر شاعر کی ناک میں تھوڑی رطوبت اور منہ میں زیادہ لعاب ہوتا ہے۔ پھر لائبریرین کی آنکھیں یوں گھومتی ہیں، جیسے صفحے اُلٹ رہی ہوں۔ مریانا کی بات چھوڑو۔ اُس کی کمر تو صفیں اُلٹتی ہے۔۔۔۔

اس اندازے میں کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہر امریکن شروع میں بے حد ذہین نظر آتا ہے۔ مگر وہ جیسے ہی دُم اٹھاؤ، مادہ" والی بات۔ اُسے ڈی سی آٹھ ہوائی جہاز کے سب کل پُرزے معلوم ہوں گے، لیکن اپنے غسل خانے کی ٹونٹی، جس کی چوڑیاں گھس گئی ہیں، اُسے کیسے بند کرنا ہے وہ نہیں جان سکتا۔

یہ تم نے دیکھا ہی ہے نا کہ اکثر ملک سے آدمی پہچانا جاتا ہے اور آدمی سے ملک۔ یہ صرف ہندستان ہے، کشمیر سے لے کر راس کماری تک پھیلا ہوا ہندستان۔۔ ہر رنگ، ہر نقش کا مالک، جس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ مگر جیسے ہی وہ منہ کھولتا ہے تو آدمی اسے پہچان لیتا ہے۔ دھت!

یہ تو وہی ہے!

اس اسسٹینٹ لائبریرین نے اپنی انگریزی میں بہت امریکی غنغنہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندی کہیں نہ کہیں سے اپنا منہ باہر نکال ہی لیتی ہے بلکہ اس عمل میں ایک عجیب دوغلی سی چیز پیدا ہوگئی ہندستانی غنغنہ!

اُس نے جو بش شرٹ پہن رکھی تھی اس پہ نیکس، پلیکس کے نخش جملے چھپے ہوئے تھے، دھندلی سی پورنو تصویروں کے اوپر در پھر ان سب کو ایک بجلی رنگ کی وسیع و عریض نکٹائی نے ایک حد تک چھپا رکھا تھا۔ نیچے بیل بوٹم کے اُس نے جیسے ارادے سے بھونسڑے نکال رکھے تھے۔ چہرے پہ دونوں طرف پشکن کی طرح کے بڑی بڑی قلموں کے گچھے... گویا وہ عام آدمی اور ہپی کے بیچ پیوند معلوم ہوتا تھا۔ وہ... کوئی کتاب ہونے کی بجائے اُس کا سرورق تھا!

یہ تم تھے؟ نہیں نہیں، تمھاری ہی طرح کا کوئی اور تھا، جس نے شادی کرنے کے لیے امریکہ سے ایک لڑکی ہپی فیرا گولو (جس کے آباو اجداد اٹلی سے جاکر امریکہ میں آباد ہو گئے تھے) آئی تھی۔ خیر فرا کو کروفائر اور گولو کو مارو گولی، لیکن ایک بات اس نے آج کے ہندستانی نوجوانوں کے بارے میں بڑے پتے کی کہی تھی۔ یہ... امریکنوں سے بھی کچھ زیادہ ہی امریکن ہیں۔ کیا مزے کی عورت تھی، باقر، وا اور عورت جو مرد سے ملے بنا ہی اس سے کئی بار مل چکنے کا عالم پیدا کر لیتی تھی۔ آج کی دنیا میں سب سچ ہے، میرے بھائی۔ کل پڑھا نہیں کہ مرغ کو تکلیف دیے بغیر ہی لوگ مرغی سے انڈے پیدا کرنے لگے ہیں... میں پھر بہک گیا اور تم بھی

مجھے نہیں ٹوکتے۔ تم بھی ذہنی طور پر وہ ہو..... وہ..... اب ہنستے کیوں ہو؟ پکڑے گئے نا؟ تم بھی اُس لڑکی کی طرح سے ہو، جس کے غسل خانے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ جاتا ہے۔ جی، غلطی سے!

وہ ہیپی فیراگولو... سیدھے مرغی سے انڈے.... ہم مرد کی جمع، مردودوں کا کیا ہوگا، باقر بھیا؟

ارے ہاں، میں بھول ہی گیا۔ یہ عورتوں کا سال ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق۔ عورتوں کو تم جانتے ہی ہو۔ کیسے وہ اپنی کمزوری کا افسانہ مشہور کر دیتی ہیں اور کمزوری کو بھول ہی جاتی ہیں۔ سال ختم ہونے دو اگر عورت سالی نے اسے صدی پہ نہ پھیلا دیا تو مجھے باپ کا نہ کہنا۔ میں مرد شوونسٹ نہیں۔ اگر صدیوں سے مرد نے اسے روندا ہے تو اب وہ اُسے روندے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تو چپکے سے سامنے پڑی رہتی ہے، جیسے روندے جانے کی منتظر... خیر وہ اُسے روندے یا یہ اُسے روندے، بات ایک ہی ہے۔ عوام اور خواص کے جدل کی طرح... مگر، غضب خدا کا عورت جو حقہ بھی نہیں پیتی، حقوق مانگتی ہے!

ضروری بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ پہلے سنیچر کاندھے پر چڑھ بیٹھا تھا، اب حیف کہ عورت سر پر سوار ہو گئی ہے ... ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنا لائبریرین دوست بھی چشمہ لگاتا تھا۔ مجھ میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ اس کے چشمے میں ڈبل کان کیو کے شیشے لگے تھے، جیسے میرے میں ڈبل کنویکس کے۔ عام، صحت مند نظر والا اگر ڈبل کان کیو میں سے دیکھے باقر بھائی، تو اسے ہاتھی بھی چیونٹی دکھائی دے گا۔ جیسے میرے میں سے چیونٹی بھی ہاتھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکنوں کو دنیا کے سب لوگ کیڑے

مکوڑے نظر آتے ہیں۔

میں ویت نام اور ماؤ لائی کی بات نہیں کرتا، کیونکہ جدیدیے مجھ پہ دزدیدہ ترقی پسند ہونے کا الزام لگا دیں گے۔ لیکن باقی دنیا ہی کا دیکھو۔ لیبیا اور اسرائیل میں انھوں نے کیا غدر مچایا ہے۔ ملکوں کو کیسے کیسے ہتھیار دے کر لڑوایا اور خود نفع کمایا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان ملکوں کے اپنے ہتھیار کُند یا متروک ہو چکے ہیں۔ کوریا میں ۸۰ فیصدی جو لیکویا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ پھر آیندے یا چِنی کا حشر دیکھا ہی ہے نا تم نے؟ ارے وہ شیخ چلی دوسرا تھا...

جیسے میں اپنے ڈبل کنویکس کی وجہ سے روسی کونسلیٹ میں ہوں، وہ ڈبل کان کیو کی وجہ سے امریکی انفارمیشن سروس میں تھا۔ لیکن قدرت بھی ہم ہندستانیوں سے عجیب عجیب طرح سے بدلے لیتی ہے۔ اُس نے اچھی بھلی اسکاچ چھوڑ کر کنیڈا کی سی گرام کا آرڈر دے دیا، صرف اس لیے کہ وہ امریکا کا پڑوسی ہے۔ میں روسی، ڈرنے والا تھوڑے ہی تھا! میں نے بھی ووڈکا کی حکم کے طریقے سے فرمائش کی، جیسے روسی کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ووڈکا روس کی نہیں، یہیں آس پاس کہیں کیرالہ میں کشید کی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ہم دونوں میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ ابھی ہمارے احساسات نے کوئی واضح شکل اختیار ہی نہیں کی تھی کہ بیچ میدان کے کود کے آگئی — مریانا!

گووانی آرکسٹرا میں سے جھنجھے والے نے زور زور سے جھانجے بجائے۔ پردے کے پیچھے سے بڑے کھرج والی پال رابسنی آواز آئی — مر...یا... نے...!

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مریانا کو مریانے بھی کہہ سکتے ہیں، یا کہتے ہیں۔ میرے اندر جو نظم پیدا ہو رہی تھی، ایکا ایکی بدنظمی کا شکار ہو گئی۔ سب قافیے غلط ہو گئے میرے۔ ہوش اُڑ گئے!

پھر گوانی آرکسٹرا — اور مریانا کا ناچ۔

چھک چھک۔ چھکا چھک

دھک دھک، دھکا دھک... ہے اے اے اے اے ے ے ے ے! — اور کمر!

یہ سب نیگرو اسپری چوال تھا اور نہ ہپی ہریسنی میوزک۔ کوئی دوغلی چیز تھی جو اب ہندستانی کے بجائے افریقی طنطنہ ہو گئی تھی۔ اصلی چھٹی تو ہوئی، جب مریانے نے کمر، ناف سے آواز نکال کر گانا شروع کیا — تم میرے لیے کیا لائے ہو؟

آرگل کی جرابیں لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا۔

تم میرے لیے کیا لائے ہو؟

موزمبیقی موتیوں کی مالا لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا

موں مارت کا عطر لائے ہو — اچھا کیا، اچھا کیا

میں تو تمھارے لیے کچھ نہیں لائی، جان!.... میرے پاس تو ایک دل ہے، جو صرف تمھارے لیے ہی دھڑکتا ہے... اور پھر — اچھا کیا، اچھا کیا...

ارے باقر میاں، مرد بڑا اُلّو کا پٹھا ہے.... وہ جانتا بھی ہے کہ ہال میں اس ایسے سینکڑوں دوسرے — تیسے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ یہی سمجھتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے کہ وہ جو بھی کہہ رہی ہے،

مجھی سے کہہ رہی ہے۔ لِٹل ہٹ، میں لڑکیاں بھی تھیں، مگر ان کا مت پوچھو۔ وہ یا تو مریانا کی نظروں سے مردوں کو دیکھ رہی ہوں گی اور یا پھر سیدھے اُس کے لباس، کو۔ حقیقت باقر بھائی جلیبی کی طرح سیدھی ہے۔ مرد سب سے زیادہ کیا پسند کرتا ہے؟۔ عورت! عورت سب سے زیادہ کیا پسند کرتی ہے۔ شاپنگ!

اس سلسلے میں تم تیار رہو، باقر، چونکہ یہ عورتوں کا سال ہے ہمارا تمھارا سب کچھ بک جانے والا ہے۔ ڈیمانڈ اتنا بڑھ جائے گا کہ سپلائی بند ہو جائے گی!

ایک بات اور بھی ہے۔ آزاد ہو کر شاید یہ عورتیں ہماری عزت کرنے لگیں۔ ہم عورتوں کی جتنی عزت کرتے ہیں، یہ خود عورتیں بھی نہیں جانتیں ... تم ہی بتاؤ ہم نے کبھی کسی کو باپ بھائی کی گالی دی ہے؟

کیا بتاؤں، دوست؛ مریانا کے ناچ گانے سے 'لِٹل ہٹ' کے رجنی گندھا اور گلاب کے پھولوں والے گلدستوں سے مہکنے لگے تھے؟ ... نہیں، میں اپنے لفظ واپس لیتا ہوں: رجنی گندھا اور ڈولا اُٹھلیا تو ایک طرف کیکٹس بھی مہکنے لگے تھے ... دیکھو، اب تم شرارت مت کرو۔ خدا گواہ ہے کہ کیکٹس کے سلسلے میں میرا اشارہ قطعاً سردار جی لوگوں کی طرف نہیں ہے۔ ایسا کرو گے تو مجھے پٹوا دو گے، مروا دو گے ... اگر میں ان کی بات کرتا تو کہتا کیکٹس بھی لہکنے لگے تھے، چہکنے لگے تھے۔ بہت وہ کرتا تو کہتا — بہکنے لگے تھے۔ مہکنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟!

کچھ دیر بعد مریانا اپنا لباس، — انجیر کا پتّا بدلنے کے لیے اندر چلی گئی تھی اور میں ہوش میں آنے کے بجائے جوش میں آچکا

تھا۔ قافیے میرے سامنے یوں کھل گئے جیسے میرا ذہن نوراللغات ہے۔لیکن بدقسمتی سے میرا اُس اسسٹینٹ بلکہ اسٹنٹ لائبریرین سے جھگڑا ہو گیا۔ بات یوں ہوئی کہ میں پہاڑی کی دُھن پر دھیرے دھیرے گانے لگا۔ پھر دماغ ہی تو ہے نا۔ میرا خیال اُس عظیم مغنیّ سہگل کی طرف چلا گیا اور میں نے اُس کارڈ انڈکس سے پوچھا۔ آپ کو یاد ہے، سہگل کب مرا تھا؟ جانتے ہو کیا جواب دیا اُس نے؟ بولا۔ ابھی ابھی، میرے سامنے ہی تو مرا ہے.... میری سینس آف ہیومر کو تو تم جانتے ہی ہو، کتنی تیز ہے۔ روسیوں کی طرح سے۔ میں اُسی وقت سمجھ گیا!

یہ امریکی سالے۔ واٹر گیٹ والے۔ اپنا اسلحہ دوسرے ملکوں میں بھیج کر انھیں لڑواتے ہیں۔ خود منافع کھاتے ہیں۔ ہم روسی بھی بھیجتے ہیں، لیکن اُن کے ہتھیاروں کو بے کار کرنے، دنیا میں امن لانے کے لیے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں اُن کے ہتھیار انھی پہ استعمال کروں۔ مجھے امریکی مارک ٹوئین یاد آ گیا۔ میں نے خالص روسی دبدبے سے اپنے مزاح کی حِس کو تھوڑا ڈِل کر کے اُس سے پوچھا۔ آپ جانتے ہیں، ایک لائبریرین اور گدھے میں کیا فرق ہے؟ ہو سکتا تھا، اس آناً فاناً کے سوال سے سیدھے ہی لڑائی شروع ہو جاتی، لیکن وہ میرے تن و توش، تخلص ہوش، روسی جوش کو دیکھ کر تھوڑا ڈر گیا اور ل۔لکنت سے بولا مجھے نہیں معلوم!

میں نے کہا مجھے بھی نہیں معلوم....

اور اپنے اس لطیفے پہ میں خود ہی اتنا ہنسا کہ آس پاس کے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ وہ مقولہ ٹھیک ہی تو ہے کہ ہنسو تو دنیا تمھارے ساتھ ہنسے

گی، روؤ تو — پھر بھی وہ ہنسے گی!

چونکہ اس کو پتا چل چکا تھا کہ میں روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہوں اس لیے اس نے سیدھے ہی روسیوں کی بُرائی شروع کر دی۔ مجھے بڑا تاو آیا۔ باقر بھائی.... کوئی تمھاری تائی کو بھی گالی دے، یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے جگری دوست ہو تو بتاؤ وہ گالی تمھیں لگے گی یا مجھے!

میں نے چشمہ اتار کر میز پر پٹخ دیا اور سی آئی اے کو گالی دی۔

وہ کے جی بی کو بیچ میں لے آیا اور میرے چشمے کا جواب اپنے چشمے سے دیا۔

میں نے خالص پرولتاری انداز سے جوتا اُتار کر میز پر مارا، جیسے خرشچوف نے اقوام متحدہ کے جلسے میں مارا تھا۔ اس سے دونوں چشمے میز پر یوں اُچھلے جیسے وہ مُرغ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں....

میں نے روزن برگ کے مار دیے جانے کی بات کی۔ میرا بس چلتا تو فیض کی نظم اُس کے منہ پہ دے مارتا.... وہ سالا سکھاروف اور سولہشٹزنسن پہ چلا آیا اور اُس کی گلاگ آر کی پیلیگو سے حوالے دینے لگا۔ ... اُس موٹے تازے کتے کی بات کرنے لگا جو فرانس میں اس لیے چلا آیا تھا کہ اُس کے اپنے ملک میں روس میں کھانے کو تو بہت دیتے ہیں، مگر بھونکنے نہیں دیتے۔

میں نے اسنووروں کی خلیج کا قصہ چھیڑ دیا (سنا ہے خاص نام کا ترجمہ نہیں کرتے) اُس نے چیکوسلواکیہ سے زنا بالجبر کی بات کی (تو کیا عام کا ترجمہ کرتے ہیں؟) میں نے مافیا، کارٹل، پورنو، بلو فلموں — سب کو بیچ میں گھسیٹ لیا اور خوب ہی اس کی بے عزتی کی۔

اب ہماری آوازیں اونچی ہو کر ارد گرد کی سب آوازوں کو بونا کیے دے رہی تھیں ارے ارے۔ اے یو، لسن۔۔۔ سب بے کار ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ یہ کیا مچھلی منڈی ہے؟۔۔۔۔ ایسے میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ برابر کی میز پہ بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی جملہ محبت کو ہونٹوں تک لائے اور پوچھ سکے۔ کب ملو گے، جان، کہاں ملو گے؟

معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری وجہ سے وہ کبھی کہیں بھی نہیں مل سکتے۔

"تم بات کرتے ہو یینکی" میں نے چلّا کر کہا۔ جس کی تہذیب ہی جمعہ جمعہ چار سو سال پُرانی ہے۔ جو کبھی مہیش یوگی کا سہارا لیتا ہے اور کبھی پربھوپاد کی دُم سونگھتا ہے۔۔۔ ہرے رام، ہرے کرشن کے بچے؟"

"تو کیومس کے نطفے۔۔۔۔"

اور ہم دونوں بیک وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور گرج گرج کر باتیں کرنے لگے "تم ہندستانی جاہل ہوتے ہو، بدتمیز ہوتے ہو" اُس نے کہا۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر تو کمرے میں چلے آتے ہو"

میں نے اسی پایدار آواز میں کہا: "ہندستانی تو ہوگا تیرا باپ۔ تو جب اس دنیا میں آیا، کوئی دروازہ کھٹکھٹایا۔ اب تک ہم دونوں مکمل طور پر روسی اور امریکن ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہیں ہاٹ لائن پر سے آواز آرہی ہے۔ روکو، روکو۔ لیکن ہم دونوں اس بات کے لیے تیار تھے کہ بٹن دبائیں اور دونوں ملکوں کے آئی سی بی ایم چھوڑ کر نیویارک اور ماسکو کو تو تباہ کر دیں، اسلام آباد اور دہلی کا پھر دیکھا جائے گا۔۔

پہلے میز اُلٹی، پھر کرسیاں گریں۔ اُن کے بیچ میں سے ہوتا ہوا لِٹل ہٹ کا منیجر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورتوں کے سال والی ایک عورت بے ہوش ہو گئی، سالی۔ کچھ لوگ موقع کا فائدہ اٹھا کر

باہر بھاگ گئے اور بل ادا کرنے کے عذاب سے چھوٹے۔ یہی نہیں کچھ لوگ دہشت کے عالم میں اندر گھس آئے۔ مریانا ونگ میں آدھی اندر، آدھی باہر دکھائی دے رہی تھی۔ چشموں کی غیر موجودگی میں صرف اتنا ہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کالا گاؤن پہنے ہوئے ہے۔ اس سالے اسسٹنٹ نے مجھے ٹائی سے پکڑ رکھا تھا مگر اس کے ہاتھ صاف کانپتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اُس کی بش شرٹ کے کالر کو اتنے زور سے مروڑا کہ اُس کا گلا گھُٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں باہر چلی آئی تھیں۔ باہر تو زبان بھی چلی آئی تھی، مگر تھوڑی سی . . . . .

اب جس زبان سے وہ گالی دے رہا تھا، وہ کسی ملک کی نہ تھی۔ یہ وہی آواز تھی، جو زبان کی ایجاد سے صدیوں پہلے انسان غاروں میں بولا کرتا تھا . . . . یا ہو سکتا ہے وہ کوئی فری میسنری ہو کوئی اسپرانٹو۔ نہیں، اب مجھے یاد آتا ہے وہ ۔کُوکُوکُوکُو کلاں تھی!

پھر ہندستانی فلم کی طرح سے جانے کہاں سے گلدان اس کے ہاتھ میں آگیا اور اُس نے میرے سر پہ دے مارا۔ اگر ہمارے فلم ساز امریکی فلموں کی نقل نہ کرتے تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ میں چکرا گیا۔ جبھی ایک چیخ سی آئی۔ ''گیٹ آؤٹ، ول یُو وووو . . . . . .'' اور ہال کے ایک طرف کی بتیاں بجھ گئیں۔ اسپاٹ لائٹ ہمیں پر تھی، جیسے کہ تھیٹر میں مرکزی کرداروں پر ہوتی ہے۔

''دیکھا نہیں'' اُس نے پاس آتے، پورا بازو باہر کے دروازے کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا ''رائٹس آف ایڈمیشن ریزروڈ'' پاس کے کسی ستم ظریف نے اُس تحریر کی طرف دیکھا جو دروازے کے باہر

لکھی ہوئی تھی اور اس طرف سے اُلٹی پڑھی جا رہی تھی۔ اُسے پہلے حرف ڈی دکھائی دیا ریزروڈ کا اور وہ بولا ـــ ڈی فار ڈیول، ای فار ایول .... لیکن منیجر کڑکا "آپ باہر نکلتے ہیں یا میں پولیس کو بلواؤں؟"

اب سچی بات ہے، باقر بھائی، روسی ہونے کے باوجود میں تھوڑا ڈر گیا۔ ہاں اس جانبداری سے مجھے لینن پرائز تو کیا نہرو ایوارڈ بھی نہیں ملنے والا تھا۔ پولیس کی دھمکی دیتے ہی منیجر بیَروں کی مدد سے خود ہی پولیس ہو گیا۔ ہم نے میز کے نیچے ہاتھ مار کر چپتے ٹٹولے، اُٹھائے اور لڑتے بھڑتے باہر کی طرف لُڑھکے، وہ امریکی مجھ سے پہلے نکل گیا تھا، ورنہ میں تو اُس کے ساتویں بیڑے کا بحیرۂ عرب بحرالہند تک پیچھا کرتا۔ حالانکہ ہال کی بجھی ہوئی بتیوں کے بحیرۂ اسود سے یہ سب کتنا بڑا فاصلہ تھا!

ٹیل ہٹ کے باہر آیا تو کوئی دھندلی سی سفید چیز جیسے اُڑتی ہوئی دکھائی دی۔ غالباً وہ اُس امریکی بلّے کی گاڑی ہوگی۔ میں نے صرف آواز سنی،

"جلدی، شوفر، جلدی...."

اپنے سسٹم سے بدلہ نہ نکال سکنے کی وجہ سے میں ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، ایسے ہی مجھ سے کوئی تکرار شروع کر دے تو میں اُسے بتاؤں، جیسے اندر کی جارحیت کو خارج کرنے کے لیے لوگ ریت کی بوریاں ٹانگ کر اُس پہ مُکّے مارتے ہیں۔ خواب میں بھیڑیے کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اُسے پھاڑ کر ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی میں... مگر کوئی ماں کا لال سامنے نہ آیا اور میں اندازے سے بس اسٹینڈ کی طرف مُڑا۔ چشمہ لگایا تو سامنے ایک چابی لگی، کھلونا بس مجھے اسٹینڈ کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی.... ارے!؟

باقر بھائی۔۔۔ ہمارے چشمے بدل گئے تھے۔ اس جھگڑے فضیحتے میں وہ میرا چشمہ لے گیا تھا اور اس کا میرے ہاتھ میں آگیا۔ فریم قریب قریب ایک ہی سے تھے یا ہمیں ایسے لگ رہے تھے۔

اُس وقت گیارہ بجے تھے رات کے، جو میں نے یونی ورسٹی کے گھڑیال میں کانوں سے دیکھے اور آنکھوں سے سُنے۔۔۔۔

میرا پہلا تجربہ بس کا تھا۔ اُس چشمے کے ساتھ۔

کچھ بھی نہ دکھائی دینے سے کچھ دکھائی دینا تو اچھا ہی تھا۔ چنانچہ میں نے وہ چشمہ پہنے رکھا، لیکن جب میں بس میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے اتنے تنگ دروازے سے میں اندر کیسے جاؤں گا؟ لیکن اپنے بدن کو سکیڑ کر میں نے ڈیک پر قدم رکھا ہی تھا تو دیکھا کہ کوئی بچہ بس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، چنانچہ میں نے اپنا پانو پیچھے ہٹا لیا۔ ایسے ہی بچے نے بھی کیا۔ شاید وہ میری بزرگی کا احترام کر رہا تھا۔ میں نے پھر قدم بڑھایا تو اس بچے نے بھی ساتھ بڑھا دیا اور میں نے پھر کھینچ لیا۔ جبھی بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ "صاحب، دارو پیے لا کیا؟"۔۔۔ اور اُس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بس کے اندر گھسیٹ لیا اور سیٹ پر جا بٹھایا۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ پانو بچے کا نہیں، میرا اپنا ہی تھا!

بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ " دیکو۔۔ کوئی لفڑا نہیں کرنے کا آں؟" وہ اب تک مجھے پیے ہوئے سمجھتا تھا۔ میں نے کہا " میں نے پی نہیں کنڈکٹر، تھوڑی سی پی ہے۔ مگر میری نظر کمزور ہے۔"

"تو یہ چشمہ کاہے کو رکھا؟" وہ بولا۔

اب میں کہاں اتنی لمبی راون کہانی دُہراتا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "ورلی ناکا آجائے تو مجھے اتار دینا۔ ۔ ۔ ۔ "

"ہو" اُس نے کہا۔ پیسے لیے ٹکٹ دیا اور دوسری سواریوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے اپنا چشمہ اُتار لیا۔ دیکھو، میں پھر اُسے اپنا ہی کہے جا رہا ہوں۔ عادت نہیں چھوٹتی نا، اس کے بغیر جیسے مجھے ہمیشہ لگتا تھا، آج بھی ویسے ہی لگا کہ بس کھڑی ہے اور سڑک کی روشنیاں اپنے گرد بے شمار کرنیں اور ہالے لیے نصف دائرے میں گھوم رہی ہیں۔ اور بڑے بڑے دھبّے، نیلے پیلے، اُودے کالے، جو نظر آتے ہیں، نئی اور پُرانی بلڈنگیں ہیں۔

پھر اضطرار، محض اضطرار کی وجہ سے میں نے پھر چشمہ پہن لیا۔ میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک بڑی پیاری دُلاری سی بچّی بیٹھی ہوئی تھی جب مجھ میں پیار اُمڈتا ہے نا، باقر بھائی، تو میں اُس کی باڑھ کو روک ہی نہیں سکتا۔ میں ہم آغوشی بھی ریچھ کی طرح سے کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ میں کسی روسی سے کم ہوں ؟ ۔ ۔ ۔

میں اُس بچّی کے گالوں پر چٹکی لینے ہی والا تھا کہ فوراً مجھے کچھ یاد آگیا اور میں نے اپنا اُمڈا ہوا پیار، اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹھیک ہی کیا میں نے، کیونکہ اگلے اسٹاپ پہ جب بس رُکی اور بچّی اُترنے کے لیے اُٹھی تو میں نے اپنا چشمہ اتار کر دیکھا۔ جو خاکہ میرے پاس سے گزرا وہ ایک جوان بھرپور عورت کا تھا۔ اُس کا سامنا! معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے آپ سے ایک فٹ آگے چل رہا ہے۔ میں اپنی اضطراری عقل سے بچا،

باقر بھائی، نہیں تو اس رات میں پٹ گیا تھا۔

مزے سے بیٹھا میں یاد کے منہ میں اُس خوبانی کو پپول ہی رہا تھا کہ بس کنڈکٹر کی آواز آئی — "ارے ارے۔۔۔مشٹیک ہو گیا، سالا" وہ کہہ رہا تھا۔۔۔۔ " ورلی ناکا تو تین اسٹاپ اُدھر رہ گیا۔ اب ہم پربھادیوی کے نیچ ہوتا"۔

"کنڈکٹر"؛ میں غصّے سے اتنا ہی کہہ سکا۔

"اُترو، اُترو۔۔۔۔لوکر۔۔ وہ بولا۔ وہ سامنے اسٹاپ ہوتا الٹا بس کا۔ جیکر آگیا تو جیاستی پیسا دینے کو پڑیں گا۔۔۔"

جیسے کنڈکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ کر بس پہ بٹھایا تھا، ایسے ہی پکڑ کر نکال بھی دیا۔ بس چل دینے کے بعد مجھے گالی یاد آئی۔ ایسا ہوتا ہے نا باقر بھائی؟

میں گھر کیسے پہنچا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اپنے گھر کے بجائے دوسرے گھر میں غلطی سے گھس جانے کی جو خوشی ہوتی ہے، مجھے تو وہ بھی نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر یا تو کو آنکھیں بنا کر سیڑھیاں چڑھا۔ جس دروازے کو میں اپنا سمجھا تھا، وہ اپنا ہی نکل آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں سیدھے کرسی پہ جا بیٹھا۔ تم تو جانتے ہو اندھے کو بھی اپنے گھر کے سب موڑ توڑ کا پتا ہوتا ہے۔ بیوی کو بات بتائی تو اُس نے اس امریکن کو بہت گالیاں دیں۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے تصور میں وہ اسے پھولوں کی چھڑی سے مار رہی ہے، کیونکہ عورت کی گالی میں وہ بات کہاں ہوتی ہے جو مرد کی گالی میں ہوتی ہے۔

اُس رات اور تو کچھ نہیں ہوا، باقر بھائی۔ میں نے عادت سے

مجبوراً پھر چشمہ آنکھ پر رکھ لیا۔ جیسے ہی مُڑ کے دیکھا تو ایک بڑی پیاری دُلاری سی گڑیا عورت باہر جاتے اندر آتے دکھائی دی۔ ہے بھگوان! وہ میری ہی بیوی تھی؟ تم تو جانتے ہو نا، باقر بھائی، للتا ایک عام روسی عورت کی طرح سے موٹی تازی ہے، اس کی کمر کمرہ ہے لیکن اب.... یہ سالے امریکی کیا پلک جھپکتے میں سترملی میٹر سے آٹھ ملی میٹر کا پرنٹ بنا لیتے ہیں! میں نے بانہہ پسار کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جانے کب سے پیار کے لیے ترسی ہوئی، اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مزاحمت بھی، جو عورتیں بہت دیر تک پیار نہ کیے جانے کے غصے میں کرتی ہیں۔ شاید اُس نے سوچا کہ انکار کیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ یہی نہیں۔ الٹا شاید عورتوں کا سال منانے کے سلسلے میں اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے.... اُسے معلوم ہونے لگا کہ کوئی چیز اُس کے پیار کے راستے میں آرہی ہے اور جلدی ہی اُسے پتا چل گیا۔ وہ بولی ”تم چشمہ کیوں نہیں اُتارتے؟“ میں نے ایک دم اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا ”خبردار!“

اتوار کے دن ساؤتھ بمبئی بند ہوتا ہے، مگر نارتھ۔ دادر، باندرہ کا علاقہ کھُلا رہتا ہے۔ آدمی چاہے تو ارجنٹ آرڈر دے کر دوسرا چشمہ بنوا سکتا ہے، لیکن انسان کو اتنی سادہ سی حقیقت بھی کون سمجھائے کہ چشمے تک پہنچنے کے لیے بھی تو چشمہ چاہیے! یا سورداس کے آشرم کا کوئی کرمچاری۔ اور پھر کون اتنے خرچ کا متحمل ہو؟ ہمیں ڈالروں کے حساب سے تنخواہ تھوڑے ملتی ہے؟

میرا اتوار جیسے گزرا، اُس سے تو شکر، جمعہ ہی ہزار درجے اچھا تھا۔ ۔۔ وہی تمھاری بات کہ گئے تھے روزے بخشوانے، اُلٹی نماز گلے پڑی۔ اور پھر آپ سے دوہرے، سنیچر اور اُس کے کوپ کو بھی نہیں مانتے۔ کوئی مانے بھی تو اُس کا کیریکٹر شیٹ خراب کر دیتے ہیں، جس سے ترقی رُک جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

آدھا دن تو میرا یہی بات سوچنے میں گزر گیا کہ اُس کارڈ انڈکس کا دن کیسے گزرا ہو گا؟ انڈکس کی نوب ڈھونڈنے کے لیے بھی توجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر وہ نوب اُسے بڈسن کار کا ڈھیل معلوم ہونے لگے تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ لے گا۔ جانے اسے کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہو گا؟ ہو سکتا ہے کہ اُس کے پاس سپیئر چشمہ ہو، کیونکہ وہ امیر آدمی ہے۔ مگر اگلے روز پتا چلا کہ اُس کے پاس اسپیئر تھا لیکن چند ہی دن پہلے اُس ہاتھی کے انڈے نے اپنا ہی پانو اپنے اسپیئر پہ رکھ دیا اور وہ کرنچ ہو گیا۔

دوسرا وہ بنوا نہ سکتا تھا، کیونکہ اُس کا آپٹیشین بھی ساؤتھ بمبئی ہی میں تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ غلطی کا پتا چلتے ہی وہ لٹل ہٹ، پہ لوٹ کے آیا کہ شاید مجھے میری غلطی کا پتا چل چکا ہو۔ اگر دو غلطیاں مل کر ایک ٹھیک نہیں ہو سکتیں تو ایک غلطی دوسرے کے ساتھ تبادلے میں تو ٹھیک ہو سکتی ہے میں نے تو خیر اس لیے بھی پرواہ نہ کی، کیونکہ اس چشمے میں مجھے اپنی غلطی بہت چھوٹی معلوم ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا اسے پتا چلے کہ اُس کی غلطی کتنی بڑی ہے!

منیجر سے منّت کر کے مبادا کے انداز میں اُس نے لٹل ہٹ میں جھانکا، وہاں سب کچھ عظیم الشان تھا، لیکن میں نہیں تھا۔ اگر میں ہوتا تو اسے انسان کی انا کی طرح سے جن دکھائی دیتا اور وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔

لٹل ہٹ میں سے مریانا کی آواز، صرف آواز آ رہی تھی معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ گا رہی ہے ـــ

تم میرا چشمہ لے آڈ ہو، اچھا کیا، اچھا کیا.....

اندر اُس کارڈ انڈکس، اس کمپیوٹر کو کچھ گلابی، کچھ گہرے دھبے سے دکھائی دیے اور پھر ایک کالا دھبا جو مسلسل ہل رہا تھا۔ اُس نے بھی اضطرار میں چشمہ لگایا تو ایک دم الٹا بھاگ نکلا، کیونکہ وہاں لٹل ہٹ، میں وہ کوئی بھینس لے آئے تھے اور وہ ناچ بھی رہی تھی!

تھی وہ مریانا.... میرے چشمے کا مہربانا!

اپنے خوف، اپنی جھلاہٹ میں اسی مبادا کے انداز میں وہ اپنے آپٹیشین کا پٹریا کی دُکان کے سامنے سے بھی گزر گیا کہ شاید دُکان کی چنک میں سے کوئی روشنی کی کرن نظر آجائے۔ لیکن کا پٹریا کی دُکان اور بھی بند دکھائی دے رہی تھی ایک تو اس لیے کہ وہ واقعی بند تھی، دوسرے اس لیے کہ وہ اُسے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اور جب اُس نے میرے چشمے کو پہن کر دیکھا.....

اس مسلسل حماقت سے اسے یوں لگا کہ وہ ایسا گلیور ہے جو جنّات کے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں سب لوگ مل کر اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ڈرا سہما ہوا وہ امریکی ہندستانی گھر پہنچا۔ شوفر اور گاڑی کی وجہ سے گھر پہنچنے میں اسے کوئی زیادہ دقت نہ ہوئی، ہوئی بھی تو صرف اتنی کہ وی ٹی کا اسٹیشن، کارپوریشن کی عمارت سب بومبیائی کے زلزلے میں اُسے اپنے آپ پر گرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر کے بلند شہری دروازے کے اندر پہنچ کر، جب اُس نے سیڑھی پر قدم رکھا تو لڑکھڑا کر گرا کیونکہ جسے وہ تیسری

سیڑھی سمجھا تھا، وہ ابھی پہلی ہی تھی۔ اُسے چوٹ بھی آئی مگر کوئی زیادہ نہیں۔
گھر کے اندر پہنچا تو اُسے ایک گدھا چھلانگیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔
اُسے بہت تاؤ آیا۔ کیونکہ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ گدھا بھی پالتو جانوروں میں سے ہو سکتا ہے۔ آخر اُس کی بیٹی جولی آئی اور اُس نے بتایا کہ بیک یارڈ میں جو دھوبی رہتے ہیں نا، پپّا۔ انھوں نے مجھے خرگوش دیا ہے!

میں نے تو اُس رات بیوی سے پیار کیا تھا نا با قر بھائی، لیکن اُس کارڈ انڈکس اور کمپیوٹر کی اپنی بیوی سے لڑائی ہو گئی۔ اِس لیے کہ بیوی اُسے اپنی طرف آتا ہوا جنیتا ٹینک دکھائی دینے لگی تھی۔ اور جب اُس سے بچنے کے لیے اُس نے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس کا سر پھٹ گیا، کیونکہ جسے اُس نے دروازہ سمجھا وہ در اصل کھڑکی تھی!

سوموار کی صبح جب میں نو ساڑھے نو بجے۔ اپنے اندازے کے مطابق لٹل ہٹ کے باہر پہنچا تو وہ چوہا میرا انتظار کر رہا تھا، اپنی بچہ گاڑی میں.... میں امن کے انداز میں آگے بڑھا، وہ جنگ کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا لیکن تھوڑی دیر میں سمجھ کے اوپر آجانے سے ہم دونوں نے چشمے اتارے اور دو بھوتوں کی طرح سے ایک دوسرے پر بڑھے' بغیر کچھ کہے سُنے چشمے بدلے، — اب ہم دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ معاف کیجیے، کے سے جملے دہرا رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا میرا قصور ہے۔ میں کہہ رہا تھا نہیں، میری حماقت.... پھر اس نے بتایا کہ کل چشمے کے بغیر اس پہ کیا بیتی۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ وہ میں تھا.... یا شاید میں وہ....

میں نے جلدی سے کہا — ''یا اللہ'' اور کان لپیٹ کر چل دیا۔

بولو

"بولو" انسپکٹر گپتے نے عاجز ہوکر کہا۔

اس کی آواز اب بازگشت ہوکر رہ گئی تھی، بلکہ ٹھیٹ رلائی۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا، "کہ، کون تھا اس قتل کے پیچھے؟"

ملزم ونائی رونائیک، بدستور خاموش تھا۔

گپتے اور اس کے ساتھی اجگاؤنکر وغیرہ نے ونائی پر تیسری ڈگری کے سب گُر استعمال کیے تھے اور اب وہ ڈر گئے تھے کہ کہیں مار کے نشان ملزم کے بدن پر رہ گئے، تو وہ خود دھر لیے جائیں گے۔ ریمانڈ کے چودہ دنوں میں سے صرف تین دن باقی تھے۔ جبکہ اُنھیں ونائی کو چارج شیٹ کے ساتھ میٹرو پالیٹن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ جو خود شکل ہی سے قاتل معلوم ہوتا تھا۔ قتل کے پیچھے سازش کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں گپتے اور اجگاؤنکر کی ہر تفتیش اندھی کالی راہوں سے ٹکرا کر خاک و خون اُڑاتی، روتی، چلاتی، ونائی ہی پر

لوٹ لوٹ آتی تھی۔

پیلا چوکی کا یہ پولیس اسٹیشن راجدھانی کے معمار لیوٹنس نے نہیں، کسی مقامی ہوتق نے بنایا تھا اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں ہوا کا رُخ حوالات کی طرف نہ ہو۔ فضا میں رطوبت اس کی سیلن کا باعث ہے۔ پھر اور باتیں — تادیب، تھرڈ ڈگری وغیرہ۔ اب تک ان دیواروں پر ہیبت کے نقشے بن چکے تھے۔ انسان کے اندر کا ڈر باہر آکر دیواروں پر مصوّر ہوگیا تھا۔ ان تجریدی تصویروں کے سامنے چینی، جاپانی ڈریگن، تبتی مہاکال، افریقی بیہولا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے چھت پر جو شکلیں بنی ہوئی تھیں، انھیں دیکھ کر تو کوئی معصوم سے معصوم بھی چلّا اٹھتا —

"گلّو کو میں نے مارا ہے، حسن توبہ کا قتل میں نے کیا ہے۔ توبہ"...

کرسی جس پر گپتے بیٹھا ہوا تھا، اس کا ایک بازو غائب تھا اور جہاں اجگا ونکر براجمان تھے، اس کے دونوں . . . . وہ دونوں بازو، دایاں اور بایاں، یا تو ونائی پر استعمال ہوئے تھے اور یا پھر ملکی سیاست میں حصہ لینے چلے گئے تھے۔ اوپر ہزار واٹ کا ہنڈہ اور ایسی کچھ اور چیزیں جمہور کی طرح نوٗ تھیں۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے حبس باہر جھانک رہا تھا، جہاں ہال میں ڈیوٹی آفیسر تین چار غنڈوں کا بیان لے رہا تھا۔ وہ عادی مجرم ایک عجیب قسم کی بے نیازی سے بیٹھے پورے انسانی جُرم سے منکر ہو رہے تھے۔ گویا وارداتیں انھوں نے نہیں، ہمزادوں نے کی ہیں۔ ایک تو بار بار اپنا ہاتھ ران پر مارتا تھا، جیسے پہلوان

لوگ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے چیلنج کے انداز میں مارتے ہیں. کوئی ننگا ہو اور اپنی برہنگی کا احساس رکھے تو ہر آتا جاتا اسے دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی اس صورت پر شرمائے نہ لجائے، اُلٹا ڈھٹائی سے دوسروں کو دیکھتا جائے تو سب کی نظر نیچی ہو جاتی ہے. کانسٹبل، میٹروپالیٹن بمبئی کے نیلے بھوت، ہتھکڑیوں کے پس منظر میں بیکار، صرف حکم کے منتظر تھے. ان کا بس چلتا تو ہر شہری کے ہاتھوں میں وہ لوہے کا زیور پہنا دیتے. محرر کا قلم جسے ہر وقت خارش رہتی تھی، دوات میں ڈوب رہا تھا اور وہ خود بے کار بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا اور ایف، آئی، آر کا رجسٹران سب لوگوں کے کرم خوردہ مسوڑھوں اور جبڑوں کی طرح سے کھُلا سامنے میز پر پڑا تھا.

باہر بارش ہو رہی تھی. بے کار کی کِن مِن کِن مِن . . . . .

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بغیر کسی وجہ، کسی سازش کے دنائی ایک خوبصورت نوجوان عورت کا قتل کر دے؟ ایشے (دیشو وہا) کے گلے میں منگل سُوتر، ناک میں پھُلّی، باہوں میں چوڑیاں جوں کی توں موجود تھیں. کارونر کی رپورٹ میں جبر تو ایک طرف کسی جھپٹ کا بھی اندراج نہ تھا. کوئی نئی یا پرانی دشمنی بھی ثابت نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ ایشے وڈالہ کے نمک والے بیرک نما کواٹروں میں اپنے شوہر نارائن اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ دنائی اس سے فرسنگ پرے ــ ورلی کے کولی واڑے میں، جہاں بومل مچھلی کی بو چوبیس گھنٹے انسان کے جسم و ذہن کا احاطہ کیے، اس کے پور پور میں بس جاتی . . . دنائی کی محبوبہ شکود ڈالے کے پاس رہتی تھی البتہ ــ اینٹوپ ہل کے نیچے، ہاربر برانچ

کی ریلوے لائن کے بازو میں، جہاں بے شمار جھونپڑیاں برسات اور ترّاکے کے میل جول سے جیسے اپنے آپ اُگ آئی تھیں۔ مگر اس کا ایشے سے کیا تعلق؟
ایشے اور اس کا میاں برہمن تھے، شکو اور اس کے ماں باپ کوئی جوڑا کٹرا امبیڈکر کی شہ پر بدھ ہو گئے تھے۔ اس پر بھی نہایت ہی لاپذیر ہندو سماج انھیں عزت سے بلانے کی بجائے بدھو کہتا تھا۔ موقع پڑتے ہی ان کی جھونپڑیاں تک جلا ڈالتا۔ انھیں جسمانی اور روحانی عذاب پہنچاتا۔ گویا بدھ ہو جانے پر بھی یہ لوگ اَچھوت کے اَچھوت ہی رہے۔ حالانکہ تاریخ کے دھندلے ادوار میں انھی کولی، ماہی گیر لوگوں کی ایک حسینہ مگس گندھا نے پانڈوؤں کے باپ سے شادی کی تھی اور آج جن لوگوں کے سامنے ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے، ان کی ماں بنی تھی۔ . . . .
پھر نارائن کا رقیب بھی نہ تھا کوئی۔ البتہ الزام ہی لگانا، قانون کو پڑانا ہو تو ہر آدمی اس مرد کا رقیب ہوتا ہے، جس کی عورت ایشے ہو!
ایشے معمول کی طرح گینپتی وسرجن کے لیے مرد عورتوں کے ساتھ سیوڑی والے ساگر کی طرف گئی تھی۔ بھوکے، ننگے لوگ . . . . .
پیٹ میں پاپڑی نہیں، تن پہ چیتھڑا نہیں۔ مگر جا رہے ہیں۔ ناچ اور گا رہے ہیں، چاہے سوکھا ہو چاہے برسات، وہ خود نہیں بیوڑہ انھیں گھسیٹے لیے جا رہا تھا شاید۔ اور یا پھر مذہبی جوش، جو بیچ میں جنون ہو ہوا اُٹھتا تھا۔ جب وہ کسی کی بھی بے عزتی کر دیتے۔ اندر کی کسی جلن سے کاروں کے شیشے توڑ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی انھیں کچھ کہنے کی۔ کیسے کہتے۔ کیونکہ پوری قوم، قومیت تھی ان کے پیچھے تھی اور شو سینا . . . . جیسے محرم میں تعزیہ نکالنے والوں کے پیچھے پوری شیعہ قوم نہیں

ہوتی؟ آٹھ بازوؤں والی درگا کے پیچھے بنگالی نہیں ہوتے؟ چاہے وہ گھاس ہوں یا نکسل باڑی؟ ایسے ہی جیسے بیوڑہ بنانے اور بیچنے والوں کے پیچھے انڈرورلڈ ہوتی ہے، مافیا ہوتا ہے۔ ایک معمولی سے ٹریفک کانسٹبل کے پیچھے پوری سرکار ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ونائک کے پیچھے صرف ونائک ہو؟

ایک، بے آرٹ، غیر مامون جذبے تلے گنپتی وسرجن والے مورتی لے جاتے، ناچتے گاتے ہوئے جارہے تھے — گنپتی بابا موریا، پڑچے ورشی لوکر آ۔ یعنی کہ اگلے برس جلدی آ۔ مگر یہ پرار تھنا تو پچھلے اور اس سے پچھلے برس میں بھی کی تھی ان لوگوں نے پھر سمپتی دینے والے گنپتی بابا نے کیا دیا تھا انھیں؟ کس کس کے گھر بھر دیے تھے؟ الٹا اس کی لمبی سونڈ اور پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے سب کے حصے کا وہ خود ہی کھا گیا ہے۔ ایرانی ہوٹل والے راشٹرپتی کی سفارش سے ایک پاؤ دیتے تھے۔ شکر بازار سے یونہی غائب ہوگئی تھی — گھاسلیٹ کے لیے میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے کیو لگتے تھے۔ اس کی نایابی کی وجہ سے گھروں میں چولھے جلنے بند ہوگئے تھے۔ کوئی زمانہ تھا عورت سونے کی کوئی چیز یا اچھی سی ساری دیے جانے پر اپنا سب کچھ دے بیٹھتی تھی، لیکن اب وہ گھاسلیٹ کے چھوٹے سے ٹن پر چلی آئی تھی۔۔۔۔

گنپتی بابا موریا، کے ورد سے یہ لوگ تھک جاتے تو کسی زٹل قافیے پر چلے آتے، جو پوری زندگی ہوگیا تھا۔ پاؤڈر والے دودھ کی بالائی مار گئی! اور پھر مار گئی، کی مناسبت سے وہ اس کے بے شمار گندی گردانیں کرتے ہوئے چلتے۔ بھیگی ہوئی چھوکریوں کے نمایاں

پچھواڑوں کی چٹکیاں لیتے، اپنے اوران کے اگاڑے مشتعل کرتے...
ایشے بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کا بدن جو ایک ہی مرد کے مسلسل مماس سے سو گیا تھا، جاگ جاگ اٹھتا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ بڑچے برس تو ایک طرف، پڑچے پل ہی میں ونائی کا رامپوری چاقو اس تن کے آر پار ہو گا اور یہ انوکھا مماس اسے کہاں کہاں پہنچا دے گا اور اس غریب کا اپناوسرجن پانی کی بجائے آگ میں ہو گا۔ ساگر میں کا بڑوانل کہتا ہے آگ پانی سے بھی بڑی ہے۔ کیا معلوم؟

بائیس، چوبیس کی ہو گی ایشے۔ یعنی اس عمر کی جس میں کہ ہر عورت اپنے وجود ہی سے کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے — میں ہوں۔ مغربی گھاٹ کی پیداوار ہونے کی وجہ سے سب ناریل اور ان میں کا سارا کھوپڑا اس کے بدن کو بنانے میں لگ گیا تھا۔ پھر کیا کیا گولائیاں، بالائیاں چلی آتی تھیں اس پر۔ اوپر کچھ ولندیزیوں، عربوں کا خون مل گیا تھا، جو بھارت کے پچھمی ساحل پر تجارت کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کے کارن نہ صرف ایشے کا رنگ سرخ و سپید تھا، جلد ریشمیں، بلکہ آنکھیں بھی عرب ساگر کی طرح سے زمردیں ہو گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب نارائن کو اس کی لاش ملی تو وہ اسے اپنے نمک والے کوارٹروں میں لے آیا۔ سب تماشائیوں کو ہنکال کر اس نے ایشے کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور قریب ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے ساتھ اکیلا رہا۔
جب دروازہ کھلا تو لوگوں نے دیکھا۔ ایشے دلھناپے کا کاٹنا لگائے پڑی ہے، اس کی ناک میں پھلّی کی بجائے کھڑا ہے، پانو کی انگلیوں میں بچھوا......

کتنا پیار کرتا تھا نارائن اس سے۔ شادی کے بعد ایک بار جب ایشے مائیکے گئی تو کسی نے پوچھا۔ کے دن رہ گئے بہو کے آنے میں؛ نارائن نے ترنت جواب دیا۔ بیس دن اور اکیس راتیں!

جب نارائن مسکرا بھی نہ رہا تھا۔

—— اب ایشے کی ارتھی نکلی تو وہ رو بھی نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو کہاں چلے گئے تھے، یہ کیا معلوم۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سب اڑوس پڑوس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنے سُرخ کاشٹے، کفن میں ایشے اور بھی گوری چٹی لگ رہی تھی۔ وہ ایک ایسی نیند سو رہی تھی، جو شبِ زفاف میں دلھن چار چھ بار نکل جانے کے بعد سوتی ہے۔

ارتھی اُٹھ جانے کے بعد اس کے بچے — ناتھو اور سبھا بار بار پوچھتے تھے —

"آئی کُٹھے؟ (ماں کہاں ہے؟) اور ایک راشٹر بھاشی جواب دیتا، آئی تو گئی . . . . . . ایسی معمولی سی ترکیب وضع کر لینے سے اس کی لسانی شہوت تسکین کو پہنچ جاتی۔

صرف دو دن رہ گئے تھے ریمانڈ میں، جبکہ انسپکٹر گیتے نے ونائی کو تفتیش کا آخری پتھر مارا۔ ونائی اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس کے ہونٹ تھوڑا بھنچ کر فوراً ہی معمول کے ہو گئے۔ ایک ٹھنڈے غصے میں جانے وہ کیا کچھ پی گیا۔ گرم غصے میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور شریانوں کی گانٹھیں ان میں سُرخ دھبے، خون کا دباؤ ایکاایکی بڑھ جانے سے تنفس گھوڑ چال ہو جاتا ہے، نتھنے پھولنے لگتے ہیں۔

ہونٹوں پہ کف چلی آتی ہے، بدن کی رگیں اور پٹھے تن جاتے ہیں، کوئی نیۓ اور ممکن وار اپنے اوپر لینے کے لیے۔ مگر وہ — ونائی، رنگ کا کالا، بدن کا کھردرا، جات کا کولی، جیسے گوشت پوست سے نہیں، کسی عقیدے کی فولاد سے بنا تھا۔ جسمانی یا روحانی مار کا اس پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس سارے سلسلے میں یا تو وہ آگے کی بہت سی صدیاں گن گیا تھا اور یا پیچھے کی۔ وہ دلت پنتھروں کے ساتھ فلرٹ کرتا تھا اور کبھی کبھی شیو سینا کے رسالے 'مارمک' میں کسی دوسرے نام سے لکھتا بھی تھا۔ اس وقت وہ تخفیف کے انداز میں کھڑا تھا، جیسے کوئی بھگت سنگھ دیس کی آزادی کے لیے پھانسی لگنے جارہا ہو — الٹا اس کی آنکھیں کچھ اور سپیدی پکڑ گئیں تھیں، کفن کی تہوں میں چھپی ہوئی نیلاہٹ اُمڈ آئی تھی جن میں ساگر ڈوب رہے تھے، اپنے اندر پوری لوکائی کا وسرجن لیے ہوئے۔ اس کا غصہ اوپر اور اوپر، لاشعور کی تہوں میں جا چھپا تھا، جہاں ساری خدائی ملتی ہے اور وہ — غصہ، کسی ایک فرد کا ہو کر رہ جانے کی بجائے پورے اجتماع کا ہو جاتا ہے۔۔۔۔

باہر آج بھی بارش ہو رہی تھی اور انسان کے نفس، اس کی سائیکی کا بیڑا غرق کر رہی تھی۔ کہاں تو پورے جولائی اور اگست کے مہینے خالی گئے تھے اور کہاں اب ستمبر کے آخر میں یوں لگ رہا تھا، جیسے ورن دیوتا بیڑ کے کیگ کے کیگ پی کے دنیا کو اپنی چھوٹی حاجت کا شکار بنا رہا ہے۔ خریف کی فصل تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ربیع اور خریف کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ فصلوں میں اسے کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ وہ تھوڑا ابہرد، تھوڑی سنسکرت

اور عربی میں شُد بُد رکھتا تھا اور بس۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے ایک ہی زبان آتی ہے، جس کا نام۔ ہے — آہ!

جب سرکار کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ، خدا کے نمائندے بنے، ایک بلیٹن شائع کر دیتے۔ خلیج بنگال میں ایک ٹرف' ایک کونڈا پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ٹائی فون بن کر اڑیسہ کے بے شمار گانو کو تباہ کرتا ہوا ذہن کینل کے ضلع کی طرف نکل جائے۔ (جہاں کھاد کا کارخانہ ہے) اور یا پھر مدھیہ پردیش سے مراٹھ واڑ، بمبئی کی طرف چلا جائے۔ کچھ علاقوں کو تو وہ باڑھ سے برباد کر گیا، اور کینول میں سوکھا ہو گیا اور لوگوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ گیا کہ ان کے لیے بھوکا مرنا اچھا ہوگا یا ڈوب کر جان دینا؟ چاروں طرف ہاؤ ہو کا نقارہ بج رہا تھا — بے زبان، بے سُر، بے تال۔

— اور دنائی چپ تھا۔ چپ صابر جابر کے سامنے تن جائے تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ سازش کی تفتیش کے سلسلے میں گپتے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ بیٹی اور پتلون اتار کر دنائی کے سامنے لیٹ جائے۔ . . . اسے ریمانڈ کے پہلے چند دن یاد آ رہے تھے، جب اس نے دنائی سے پوچھا تھا —

"تم نے ایشے کو کیوں مارا؟"

دنائی نے یونہی سا سر ہلا دیا۔ جس کا مطلب تھا۔ ایسے ہی۔

"اس لیے کہ وہ اونچی جات والی تھی؟"

"نہیں۔"

"امیر عورت تھی؟"

"نہیں۔"

"خوب صورت اور جوان تھی؟"

"نہیں، نہیں، نہیں۔" ونائی نے قدرے برافروختگی سے کہا۔ "شکو اس سے کہیں زیادہ سندر، کہیں زیادہ جوان ہے۔"

"شکو؟" گپتے نے اپنی کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ کالی کلوٹی کوئی چھوکری جو آٹھ آٹھ آنے میں ــــ"

اس سے پہلے کہ گپتے اپنی بات پوری کرتا، ونائی ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا "باسٹرڈ! ...... تمھاری بہن سے اس کا ریٹ زیادہ ہے ..."

یہ وقت تھا، جبکہ گپتے نے ونائی کو پہلا اور بھرپور تھپڑ مارا۔ اس کی انگلیاں اس نوعمر مگر سرکش لڑکے کے گالوں میں کھُب گئیں وہ ہل نہ سکتا تھا کیونکہ حولدار اور کانسٹیبل لوگ مضبوطی سے اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ونائی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، نہ ہی انگلیوں کے نشان آئے؛

گپتے نے اپنے سینیر اجگاؤنکر کی طرف دیکھا۔ ونائی بولتا چلا گیا ــ "دنیا کے نائینٹی نائن پرسینٹ لوگ اگر ایک ٹکے میں بکتے ہیں تو تم آدھے میں ...... وہ سب دلت جاتی کے ہیں۔ رنگ کے کالے، پر صحت والے ......"

جبھی گپتے نے کرسی کا بازو کھینچا اور پے در پے ونائی پر برسانا، اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد ونائی لڑکھڑایا اور پھر ان سب کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور یوں اس تفتیش کا پہلا

سیشن ختم ہوا۔

رات مرہم پٹی ہو جانے کی وجہ سے ونائی ہوش میں آچکا تھا۔ پوری رات وہ سیلے فرش پر پڑا رہا۔ کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ کچھ ڈھکا، کچھ ننگا، مغربی گھاٹ کا کوڑیالا کو برا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے فرش پر رات کی دو سوکھی روٹیاں پڑی تھیں جو اب تک پاپڑ ہو گئی تھیں۔ دال کے کٹورے میں سمار ورع قسم کی ایک سفیدسی جھلی چلی آئی تھی۔ اور جب وہ ختم ہوئے تو ونائی کو کاٹنے لگے چیونٹوں نے جب دیکھا کہ اسے کاٹنے سے وہ خود ہی مرنے لگے ہیں تو بھاگ کر چینوٹیالہ میں دبک گئے۔

انسپکٹر لوگ آئے۔ ان کے چہروں کی رگیں اور پٹھے کچھ ارادوں سے تنے ہوئے تھے۔

"ونائی" اجگاؤنکر نے پکارا۔

ونائی اٹھا، گرا، پھر اٹھا اور اپنا کوبرئی بھن تان کر اجگاؤنکر کو درست کرنے لگا — "ونا ٹیک راؤ۔۔۔ ونا ٹیک راؤ۔۔۔"

"او کے۔۔۔۔ او کے" اجگاؤنکر نے اپنے بید کو بغل میں اڑستے ہوئے کہا — "مسٹر ونا ٹیک راؤ۔۔۔۔"

"THAT'S RIGHT" ونائی نے کہا۔ اس کے چہرے پر اب نفرت کا ایک احساس تھا۔ بازو کے ایک جھٹکے سے اس نے گردن پر رات کا لگا ہوا پسینہ اور میل پونچھا اور اجگاؤنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اجگاؤنکر نے پوچھا — "تم ہوٹل نیرج کے پروپرائٹر کو جانتے ہو؟"

"نہیں" ونائی نے جواب دیا "ہاں ایک بار کھانا کھایا

تھا اُدھر۔"

تم جانتے ہو، جوزف پریرا، اس کا پروپرائیٹر، ٹاؤن کونسلر کلکرنی اور وڈالے کے کچھ نبیٹوں کے ساتھ مل کر کا جو اور فینی بیچتا ہے۔ گوا سے میرہ منگواتا ہے، فارن سے سکاچ ؟"

"یہ میں نہیں جانتا ـــ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کا دھندا تم مادر ـــ کو ہفتہ کھلائے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتا . . . ."

اجگاؤنکر تلملا کر رہ گیا۔ بات سچی مگر یوں دو ٹوک تو کمشنر نے بھی نہیں کی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا اور پھر گپتے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ یہ کیس دراصل اُسی کا بے بی تھا۔ یہ ایسے ہی تھا، جیسے کورٹ میں استغاثہ جب اپنی جرح ختم کر لیتا ہے تو وکیل صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "یور کیس"۔

گپتے نے کہا۔ "راؤصحیب . . . . آپ کے نالج میں ہے، جوزف پریرا ایشے پر آنکھ رکھتا تھا ؟"

"آنکھ رکھتا تھا کہ ٹانگ رکھتا تھا . . . ." ونائک نے جواب دیا۔ "کون، کسے، کتنے دھکے لگاتا ہے . . . میں کیا اس کا اکاونٹ رکھتا ہوں۔"

"تمھیں پتا ہے پریرا اور علاقے کے دادا اکرم نے دادر اور پریل کے کراس روڈ پر جہاں مہابیرجی کا مندر ہے، ایشے کو چھاتی سے پکڑ لیا تھا ؟"

"ہوں۔"

"پھر شور مچ جانے پر پریرا بھاگ گیا، مگر اکرم پکڑا گیا۔ لوگوں

نے اسے مارا؟"

ونائک نے اس بات پر سر ہلایا اور بولا: "اس لیے مارا کہ سالوں میں خود ہمت نہیں تھی چھاتیاں پکڑنے کی۔"

ونائک ہنس رہا تھا۔

"اس سے پریرا کی بے عزتی ہوئی۔" گپتے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایشے کا دھندہ چوپٹ ہو گیا۔"

"تب؟"

گپتے نے آواز کو بلند کیا۔ "تب، بدلہ لینے کے لیے اس نے ایک اجیر، ایک ہاٹرلنگ رکھا؟"

"ہوں۔"

"اور وہ ـــ تم تھے..... تم... تم..."

اس سے پہلے کہ ونائک جواب دیتا۔ اجگا ڈنکر نے گویا چھت ہی پھاڑ دی۔ کے روپوں میں فیصلہ ہوا؟... بولو...؟

"بولو۔" گپتے اس کے ساتھ ہی گرجا۔

ونائک خاموش رہا۔ انسان ہمیشہ اس لیے خاموش نہیں رہتا کہ وہ مجرم ہے..... وہ تھک بھی جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا۔ جب آدمی اس قدر بھائیں بھائیں کرتے ہوئے خاموشی کے سامنے نہ صرف بے بس ہو جاتا ہے، بلکہ کانپنے لگتا ہے۔ نامرادی میں، غصے میں۔ جبھی دوسری کرسی کے بازو ونائک پر ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ مفتوح فاتح تھا۔ اس کی ناک ہی سے نہیں، کان سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ جو دماغ سے

جریان کی علامت ہے۔ گپتے اور اجگاؤنکر دونوں کی چھٹی ہو گئی۔۔۔۔۔۔

"ڈھوکے!" گپتے نے گھبرائی ہوئی آواز میں حوالدار سے کہا۔ "بھاگو ۔۔۔۔۔۔ ناکے پر جاؤ اور برف لاؤ۔"

حولدار ڈھوکے نے "ہو" کہا اور سیلوٹ کے تکلف میں پڑے بغیر باہر کی طرف لپکا۔ پیچھے سے گپتے نے تائیدی آواز دی۔

"پوری سِل لانا۔"

۔۔۔۔ دو روز بعد تیسرا سیشن ہوا۔ ونائی بچ گیا، جبکہ گپتے، اجگاؤنکر اور کچھ کانسٹبل مل کر ونائی کے پھسل کر گرنے اور گر کر زخمی ہو کر مر جانے کا پنچ نامہ تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ تیسرے دن ڈاکٹر آئی، آئی بگلانی کی مدد سے انھوں نے ونائی کی زبردستی فیڈنگ کی۔ طاقت کے انجکشن دیے تاکہ اسے تندرست بنائیں اور پھر ماریں۔

یہ دیکھ کر کہ اس وقت اذیت دینا ٹھیک نہیں ہے گپتے اور اجگاؤنکر نے پینترا بدلا۔ ونائی کے پاس آتے ہوئے اجگاؤنکر نے کہا۔

"ونے ۔۔۔۔۔۔"

ونائی چوکنا ہو گیا۔

"تم میرے بھائی ہو۔"

"ہوں۔"

تمھارا گانواڑوت اجگاؤں ہی کے پاس ہے۔"

"ہوں۔"

اس سے پہلے کہ اجگاؤنکر اپنا ہاتھ کسی مصنوعی میلان سے ونائی کے کندھے پر رکھتا۔ ونائی نے پوری قوت سے یوں جھٹک

دیا کہ وہ اجگاؤنکر کی بیٹھ سے جا لگا اور اسے موچ آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گپتے، حوالدار ڈھوکے اور دوسرے کانسٹبل حیران تھے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے، پہروں بھوکا رہنے کے باوجود اس چھوکرے میں اتنی طاقت کہاں سے چلی آئی؟!

"میں تمھاری مار سہہ سکتا ہوں"، وناؤ بولا "پیار نہیں"۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وناؤ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے ہیں اور کتنی محنت، کتنی مشقت سے وہ انھیں کہیں اوپر بھیج رہا ہے۔ مگر چونکہ آنسو اور جذبہ ہم زلف ہوتے ہیں، اس نے کسی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کہا "میں نے جو بولا ہے، سچ بولا ہے"

"سچ کہتے ہو" گپتے نے نرمی سے کہا "اس گھات کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ نہیں؟"

"نہیں"

اور پھر وناؤ اپنے آپ شروع ہو گیا، جیسے کوئی صفائی یا تزکیہ چاہتا ہو۔ "میں اسے جاتی، مت بھید کے لیے مارتا تو بدلہ لینے کی بات ہوتی، پیسے کے لیے مارتا تو چوری بیری، لوٹ مار کی۔ شریر کے لیے مارتا تو ریپ کی ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہوں ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔" گپتے اور اجگاؤنکر نے ایک ساتھ کہا اور ٹوٹی کرسیاں آگے سرکائیں۔ وہ یک رُکنی الفاظ صرف وناؤ ہی کا ٹھیکہ نہ تھے۔

"میں نے ایشے کو اس لیے مارا" وناؤ نے گروہ سے کہا۔ "گینفتی وسرجن کے پورے کراؤڈ میں وہی تھی، جس کا کچھ نہیں بگاڑا

تھا۔ جو بہت خوب صورت لگ رہی تھی، اور انوسنیٹ "۔

پھر تھوڑی دیر کے لیے وہ رُک گیا۔ جیسے وہ رُکا تھا، ویسے ہی شروع بھی ہو گیا۔ "میں کسی ایسے کو قتل کرنا چاہتا تھا، جو ایک دم معصوم ہو، دیوی ہو، دیوتا ہو۔۔۔۔"

گپتے اور اجگا ڈنکر کے چہروں پر ابتری پھیل گئی۔ اب جو انھوں نے کہا وہ الفاظ کی مشت زنی تھی ـــــ "تمھیں پتا تھا، ایشے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ناتھو، سلبھا؟"

"ـــ اور صرف ایک پتی "۔ ونائک نے جیسے پورے عمرانی نظام پر چوٹ کی۔

کچھ دیر خاموشی حکومت کرتی رہی۔

"تم دلت پینتھر ہو؟" آخر اجگا ڈنکر نے اس سکوت کو توڑا، قانون شکنی کی۔ ونائک نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوال کو جواب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

"کرانتی کار؟" گپتے نے تضحیک کے انداز میں کہا۔ "بلیک پینتھر؟ چے گوارا کے پیرو؟ الفتح۔۔۔"

"میں ان سب کا باپ ہوں "۔ ونائک نے ایک دم ایکسائٹ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک بے قصور کو مارا ہے "۔ اور پھر اسی دم بولا۔ "ان کا باپ اور تمھارا پوھنا (داماد) "۔

گپتے اُچھل گیا، مگر اجگا ڈنکر نے اپنی مضبوط باہنوں سے اسے دبا دیا۔ اور بولا۔

"جانتے ہو تمھارے جرم کی سزا موت ہے؟"

ونائک نے سر ہلایا۔" اسی لیے تو یہ سب میں کیا ہے ۔ ۔ ۔ تم مجھے مارنا چاہتے ہو اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ بولو، جیت دونوں میں کس کی ہوئی؟ ۔ ۔ ۔ بکواس یہ ہے کہ اب تم میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی مارنا چاہتے ہو۔ جیسے ایک آدمی کے مارنے سے تمہارے قانون کی کھجلی دور نہیں ہوتی۔"

اور یہاں سے ونائک کا ٹھنڈا غصہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا، کیونکہ اس کا چہرہ بے رنگ تھا، کسی قسم کے تاثر سے عاری، جبکہ گیتے نے کہا ۔۔۔" مرو گے تو پتا چلے گا مرنا کیا ہوتا ہے؟"

"WHAT A DONKEY ?" ونائک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

گیتے اور اجگاؤنکر نے اوپر سے ہزار واٹ کے ہنڈے کی روشنی ونائک پر پھینکنا شروع کر دی اور بھی بہت سی چیزیں تھیں پوچھنے کی خاطر کے لیے۔

دنیا کے کسی نہ کسی حصے پر ہر سال، ہر وقت برف پڑتی ہے۔ ابھی وہ پگھل بھی نہیں پاتی کہ اس پر اور برف پڑ جاتی ہے اور وقت کو منجمد اور توسل بنا دیتی ہے۔

ونائک کی دنیا کا نقطۂ انجماد اسی دن سے بسیط ہونا شروع ہو گیا تھا، جبکہ وہ کولی ماں باپ کے گھر پیدا ہو گیا۔ وہ ساڑھے چار سال کا تھا جبکہ اس کا باپ، رتنا کولی، ریڈ سگنل کے باوجود اپنی ناو لے کر سمندر میں نکل گیا۔ اسی شام چاند اور نیپچون نے مل کر نہ جانے کیا سازش کی کہ رتنا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ وہی مچھلیاں جنھیں

رتنا کو لی کھانا، پکانا اور بیچنا چاہتا تھا، مل کر اسے ہی کھا پکا اور بیچ گئیں۔ ماں ایک سپیرے کے ساتھ بھاگ گئی اور کچھ برسوں کے بعد ونائی کے لیے تین بہنیں اور دو بھائی لے کر لوٹ آئی۔ ونائی اسکاٹش آرفینج میں پڑھا، جو نام ہی کا آرفینج ـــ اناتھ آلیہ ہے، مگر اس میں صرف ناتھ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ونائی اگر وہاں پڑھا تو یہ فادر کرخانیس کی مہربانی تھی۔

وہ نقطہ اسی سال سمٹنا شروع ہوگیا، جبکہ لوگوں نے گینتی کی مورتی گھر میں استھاپت کی اور پھل پھول اس کی سیوا میں بھینٹ کرنے لگے۔ اس دن ونائی اینٹوپ ہل کے دامن میں شکو سے آخری بار ملا۔

شکو ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ایک پرانا ٹین تھامے کھڑی تھی اور بے حد پریشان نظر آرہی تھی۔ اس کی زلفیں وہم کی طرح سے لمبی آنکھیں گمان کی طرح سے دھندلی اور بدن یقین کی طرح سے سخت تھا۔ گویا اینٹوپ ہل کے ادھر آبنوس سے بنی ایک اپسرا تھی اور ادھر فولاد سے بنی اپسرا ـــ ٹرا مبے کا ری ایکٹر۔ یہ میں ری ایکٹر کی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ شکو کا پورا بدن ایک بریتا تھا، جس کی کنی کنی یورینیم تھی اور نس نس کوبالٹ۔ وہ معدنیات کی ایک کان تھی، جسے کسی نے ابھی تک پراسپیکٹ نہیں کیا تھا۔ وہ دھاتوں کا خزانہ، اسے ایک ہی دھات چاہیے تھی اور وہ بھی صرف ونائی سے۔ . . . اسے نشچے ہوگیا تھا کہ یہی وہ مرد ہے جس کی وجہ سے اپنا آپ کم پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جب شکو نے بتایا کہ وہ اور اس کے ماں باپ رات سے

بھوکے ہیں، کیونکہ گھاسلیٹ کے نہ ہونے سے چولھا نہیں جلا تو ونائی نے اپنے اسی یک رُکنی انداز سے کہا ــــ" ہوں "!

" ہوں کیا ؟ " شکو نے ادا سے پوچھا، جس کے جواب میں ونائی نے پھر وہی "ہوں" دہرا دی۔ جو آواز پہلی " ہوں " سے مدھم تھی، کیونکہ وہ سمجھ سے تعلق رکھتی تھی۔

جبھی، اسے قدوائی روڈ پر ماٹنگا سائین کی طرف جاتا ہوا ایسو کمپنی کا ایک ٹینکر دکھائی دیا۔ جس میں گھاسلیٹ تھا۔ پیچھے اس کی ٹونٹی سے مٹی کا تیل قطرہ بقطرہ ٹپک رہا تھا۔

ونائی نے شکو کے ہاتھ سے گولڈ فلیک کا ٹین جھپٹ لیا اور ٹینکر کے پیچھے دوڑا۔ سامنے ایک ٹرک کے آہستہ ہو جانے سے ٹینکر کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ ونائی اچک کر اس کے پیچھے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سیڑھی تھامی اور دوسرے ٹین کو ٹونٹی کے نیچے کر لیا وہ چاہتا تو پھرکی گھما کر ایک ہی سیکنڈ میں وہ چھوٹا سا ٹین بھر لیتا مگر اس نے سوچا وہ صرف وہی تیل لے گا، جو گر کر سڑک پر ضائع ہو رہا ہے . . .

شکو، کلیجے پر ہاتھ رکھے کھڑی دور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سگنل موافق نہ ہونے سے ٹینکر تھوڑا نا کے پر رُکا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مڑ کر سائن ماٹنگا روڈ پر ہو لیا۔ ریل کا پُل پار کرتے ہی ونائی کا ٹین بھرنے لگا۔ جبھی راشن کی دُکان پر گھاسلیٹ کے لیے لمبے کیو میں لگے ہوئے لوگوں نے دیکھا اور شور مچا دیا ــــــ

" چور، چور . . . " ونائی کا ہاتھ سلپ ہو گیا اور وہ نیچے سڑک پر گر گیا۔ ٹینکر رُکا۔ لوگ لپکے اور ونائی کو پکڑ کر اُسے مارنا شروع کر دیا۔

ٹینکر کا ڈرائیور اس کا کنڈکٹر ساتھی اسے گھسیٹتے ہوئے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے لگے۔ ونائی کو صرف ایک ہی چوٹ آئی تھی اور وہ یہ کہ ٹمین کے ساتھ گھاسلیٹ بھی نیچے گر گیا تھا۔

ونائی نے نہیں مگر جانے کس نے شکو کا نام لے دیا۔ اس دن بہت گرمی تھی کیونکہ بادل تنے تھے، مگر چھینٹا نہیں پڑ رہا تھا۔ جبھی پولیس کا ایک آفیسر جیپ لیے اینٹوپ ہل کی جھونپڑی میں پہنچ گیا ۔ تفتیش کے لیے۔ اس نے شکو اور اس کے ماں باپ کو بتایا کہ ونائی حوالات میں ہے۔ اس پر چوری، ڈاکے سے ہائی وے رابری، کے دوش لگے ہیں۔ شکو ایک تو پہلے ہی بھوکی تھی۔ اس پر ونائی کے پکڑے جانے کی بات سن کر وہ کانپنے لگی۔

"اسے مارا تو نہیں؟" وہ بولی۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا اسے پیاس لگی تھی۔ اس کی وجہ گرمی تھی یا شکو، یہ نہیں معلوم۔ لیکن جب شکو نے گھڑے سے پانی نکال کر اسے دیا۔ تو اس نے لینے، پینے سے انکار کر دیا۔ شکو نے سوچا کوئی بات نہیں۔۔۔ اونچی جات کا ہوگا۔ آفیسر نے بتایا، ونائی گھر آ سکے گا جب کوئی اس کا ضامن بنے گا۔

شکو نے چھاتی پر ہاتھ رکھا اور بولی "جامن میں بنوں"

"تم؟" شکو کے باپ نے کہا — "تمھارے۔۔۔"

جب تک شکو غلیل کے گُلّے کی طرح سے باہر چھوٹ گئی تھی۔

آفیسر اٹھا اور شکو کے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے بولا "گھبراؤ نہیں کاکا، شخصی — پرسنل ضمانت بھی ہوسکتی ہے۔۔"

اور وہ باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے نے وتسلا، شکو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں شک تھے۔ مگر وتسلا بائی بولی۔ کوئی بات نہیں، جانتی نہ ہوتی تو آجائے گی، شکو۔۔۔"

ونائی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے ڈیوٹی آفیسر کو دیکھ کر چلاّ رہا تھا۔

"میں نے کوئی چوری نہیں کی، انسپکٹر۔۔۔ کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ٹینکر سے گھاسلیٹ ٹپک رہا تھا، سڑک پر گر کر ویسٹ ہو رہا تھا۔"

ڈیوٹی آفیسر بنیے کی طرح کسی امیر گاہک کی طرف متوجہ تھا۔

پولیس آفیسر کی جیپ پہلے آگئی، جس سے اُتر کر وہ پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ جہاں راستہ کوارٹروں کی طرف جاتا تھا۔ ونائی نے شکو کو دُور سے آتے دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی اور اس کی گھنگھور زلفیں پیچھے کی طرف اُڑ رہی تھیں، کہیں برسنے جا رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کانسٹبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور کہا: "ونائیک راؤ۔۔۔ باہر!"

ونائی جو اس ارتقا کے لیے تیار ہی نہ تھا، بولا — "کیا مطلب؟۔۔۔ کیوں؟ کیسے؟"

باہر آیا تو اس نے شکو بائی کو ڈیوٹی روم میں نہ پایا۔

"میری ضمانت کس نے دی ہے؟۔۔۔ کس نے بیل آؤٹ کیا ہے مجھے؟" اس نے ڈیوٹی آفیسر سے پوچھا، جس نے باہر کی طرف

اشارہ کیا۔
ونائی نے دیکھا شکو پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر جارہی ہے اور وہ اپنی نہیں کسی اور ہی کی چال چل رہی ہے . . .
اس سے پہلے کہ وہ باہر لپکتا، ڈیوٹی آفیسر نے اسے روکا اور ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا — " ہئی کرو . . . . ۳ راکتوبر کو پاندرا کورٹ میں حاجر ہونا مانگتا سمجھا ؟"
ونائی نے جلدی سے کاغذ پر دستخط کیے، اس کی نقل ہاتھ میں چرمر کی اور پھر باہر کی طرف بھاگا۔ سڑک سے ادھر ٹریفک سگنل کے سامنے ہی ونائی نے شکو کو آ لیا۔
"شکو!" ونائی نے کہا . . .
شکو کچھ نہ بولی۔ وہ رو ہی تھی اور نہ ہنس رہی تھی — وہ اس عالم میں تھی جس میں انسان دیکھتا ایک چیز ہے اور سوچتا دوسری اور سوال کرنے والے کی طرف مڑ کر صرف اتنا سا کہتا ہے ۔ ایں ؟
ونائی نے شکو کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا — "کیا ہوا شکو ؟"
"کچھ نہیں" شکو نے جواب دیا۔
ونائی اس کے پیچھے ہو لیا۔ اور کچھ نہیں تو ٹرافک سے اسے بچانے کے لیے۔ سگنل کے پاس پہنچ کر ایک بار ونائی نے مڑ کر پیچھے پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھا، جس کی دیواریں ٹھوس کنکریٹ سے بنی تھیں۔

سگنل کے دوسری طرف سڑک پر رُکی ٹریفک ابھی راستہ نہ دے رہی تھی۔ وہ دونوں پیرا پٹ پر کھڑے تھے۔ جبکہ ونائی نے پھر پوچھا — "شکو! بول تو سہی کیا ہوا؟"

شکو نے ایک فریادی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔

"تم نے میری ضمانت دی ہے؟" ونائی نے پوچھا۔

"—"

"کیسے دی ہے؟ تمھارے پاس . . ."

شکو نے حقارت کی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں زبان سے زیادہ ناطق تھیں جو کہہ رہی تھیں — مرد کی جات کتے کی ہے . . . وہ اگر اپنی زبان کو شرمندۂ الفاظ کرتی تو ونائی کہتا — کتے کی نہیں، بھیڑیے کی۔ مگر وہ ہی بے گانی چال چلتی ہوئی سڑک پار کر گئی اور قدوائی روڈ کی پٹری پر ہولی۔ ونائی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور بولا — "شکو!"

شکو پلٹ کر الٹ کر ونائی سے آ لگی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر اپنا دُکھ رو لے گی، سُکھ بولے گی۔ مگر نہیں۔ شکو اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اسے ونائی سے نفرت تھی، اپنے آپ سے نفرت تھی . . . وہ چل دی!

ونائی بھونچکا کھڑا رہ گیا اور شکو کو جاتے دیکھنے لگا۔ جس نے اپنے کا نشٹہ کا بلوسہ میں ٹھونس لیا تھا اور جا رہی تھی۔ سامنے بائیں ہاتھ برہاسٹل، بابر برانچ کی ریلوے لائنیں اور اینٹوپ ہل کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

دنائی سب جان گیا تھا، سب سمجھ گیا تھا وہ کتنا کہنا چاہتا تھا شکو تم نردوش ہو کنواری ہو۔ . . ابھی حالات میں سبزی بیچنے والی شانتا کو اس کے پتی نے گھر سے نکال دیا تھا اور آج وہ فارس روڈ کی جنگو بائی کے قحبہ خانے میں رہتی، دھندا کرتی ہے۔ روز رات چھ سات مرد اسے روندتے دَلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اس سے کم ہوں تو نہ وہ میڈم، نہ دلال کے پیسے دے سکتی ہے اور اسے پھیری والے کی سوکھی روٹی اور مرچ کھانی پڑتی ہے۔ لیکن وہ کنواری ہے کیونکہ نہ اسے اپنے گاہکوں سے محبت ہے، نہ اپنے پتی سے تھی . . . .

دنائی کا خیال تھا، شکو آخر اسے بلائے گی، لوٹ کر آئے گی۔ مگر نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب دنائی کے قابل نہ سمجھتے ہوئے جا چکی تھی۔ دنائی نے آخری بار اسے اپنی نظروں کی سرحد پر دیکھا اور چلاّ اُٹھا ــــ "میں ۳ر اکتوبر نہیں آنے دوں گا . . . میں تین اکتوبر نہیں آنے دوں گا . . . "

اور اسی عالم میں وہ بھاگتا ہوا ماٹنگا کی بھاری ٹریفک میں کہیں گم ہو گیا . . . (تھا)

بِلّی کا بچّہ

کچھ نہیں۔ کوئی کام نہیں تھا، ایسے ہی چھپّیٹا کے باہر نکل گیا تھا۔ سرحد پر لڑائی کے کارن سب کاروبار سُست ہو گئے تھے۔ زندگی میں جس ارتعاش کو ہم ڈھونڈا کرتے ہیں، وہ لڑنے کے لیے محاذ پہ چلا گیا تھا اور جو بچ رہا تھا، روزانہ اخباروں میں سمٹ آیا تھا۔ بار بار پڑھے جانے کے باوجود جو آدھ پون گھنٹے میں ختم ہو جاتے تھے۔

... نوعمری میں ایسا ہوتا تھا۔ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ باہر نکل جاتے تھے — آج کچھ ہونے والا ہے! ... ہوتا ہوتا جب بھی کچھ نہ تھا، چنانچہ آج بھی کچھ نہ ہوا، سوائے اس واقعے کے جس کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا....

میرے ساتھ بے کاروں کی پوری کی پوری پلاٹون تھی جیسے کوئی فوجی دستہ دشمن کی نقل و حرکت بھانپنے کے لیے نکل جاتا ہے اسی طرح ہم بھی نکل جاتے تھے اور اس اسٹوڈیو سے اُس

اسٹوڈیو تک گھومتے رہنے کے بعد شام کو برٹورنی پہنچ جاتے، جہاں تلے ہوئے نمکین کاجو کے ساتھ چائے یا کافی کی ایک آدھ پیالی پی لیتے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے — کون بل دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد، اپنی جیب کی بجائے، ہم ایک دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگتے، جو ہوتے ہوتے گریبان تک پہنچ جاتے، آخر بل کون دیتا؟ — یہی بے کاری کا احساس جس کی ہڈیوں تک میں بس گیا تھا — باپ رے!

کوئی بے کاری سی بے کاری تھی؟

رات کو دیکھ کے دن یاد آیا

اس پہ برٹوری کی ہیریٹ کو تھینک یو بھی مجھے ہی کہنا پڑتا —

پھر کلیان، رشی اور ہمارا عیسائی دوست جسے ہم "جیگوار" کہا کرتے تھے، شکار کے لیے نکل جاتے جسے وہ سیروسیاحت کہتے۔ یہ ماں کے مارکو پولو چین تھوڑے ہی جاتے؟ بس میرین ڈرائیو پہ پہنچ کر دو دوسو گرام گنڈیریاں چوستے، کچھ چھلکے بولے وارڈ پہ پھینکتے اور کچھ سمندر میں اور لہروں کے ساتھ انھیں واپس آتے ہوئے دیکھتے۔ یعنی ان کی ہر چیز کچھ دور جا کر واپس آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ پھر ڈھسکی کی بھولی بسری یادیں یہ لوگ گیلی اور نمکین مونگ پھلی کھاتے۔ آخر بدمزہ ہو کر نریمان پوائنٹ پہ سولہ ملی میٹر کی پروپیگنڈا فلم دیکھنے لگتے، جس کو حکومت کسی اندیشے میں مفت دکھاتی۔ پھر گھبرا کر گھر لوٹ آتے، جہاں ان کی بیویاں ان سے دن بھر کی کارگزاری لفظ بہ لفظ سننے پہ اصرار کرتیں اور ان کے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سمجھتیں۔ ایک جنس کے احساس

کے ساتھ ان کا جی پھر باہر بھاگ جانے کو چاہنے لگتا۔

درحقیقت ہم سب کا گھر باہر ہو رہا تھا اور باہر گھر۔ جب شہر کی طرف جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے گھر لوٹ رہے ہیں اور گھر لوٹتے تو یوں لگتا جیسے باہر نکال دیے گئے۔ اس ''باہر'' کی کھلی ہوا میں بیوی کے پھپھوندی لگ جاتی۔ ہاتھ لگاؤ تو ہاتھ پہ چلی آتی، جس سے گھبرا کر ہم اسے ''گھر'' چلنے کا مشورہ دیتے لیکن وہ صاف جواب دے جاتی ـــ ''گھر'' میں خرچ ہوتا ہے۔ ہم یہیں ''باہر'' اچھے ہیں۔

آج ہم بیرسین ڈیری جانے کے لیے نکلے تھے۔ اگر آپ بمبئی کے جغرافیے سے واقف نہ ہوں تو میں آپ کو بتا دوں ـــ بیرسین ڈیری ایک ریستوران ہے جو بمبئی کی میک موہن لائن پہ واقع ہے۔ یعنی شہر کی سرحد وہاں ختم ہو جاتی ہے اور سمندر شروع ہوتا ہے۔ ڈیری کا لفظ تھوڑا مغالطے میں ڈالتا ہے کیونکہ وہاں گائے بھینس نہیں ہوتیں صرف کچھ موٹی عورتیں ہوتی ہیں، جن کے اسکرٹ اور ساریاں سمندر سے آنے والی تیز ہوا اڑاتی رہتی ہے اور جنھیں سنبھالے ہوئے ان کا معنوی حسن اور بڑھ جاتا ہے اور عشق کے مارے کولوا موہوم امیدیں لیے سامنے بیٹھ کر سیبو سیبو پیا کرتے ہیں، جو سیب کے رس سے بنتا ہے اور جس کے لیبل پہ صاف لکھا ہے ـــ اس میں شراب نہیں ہے!... کولا سے گھبرا کر لوگ سیبو سیبو پیتے ہیں اور سیبو سیبو سے وحشت ہوتی ہے۔ تو کولا پہ لوٹ آتے ہیں جیسے پڑھے لکھے لوگ پالیٹکس سے گھبرا جاتے ہیں تو سیکس پہ چلے آتے ہیں اور جب سیکس سے وحشت ہونے لگتی ہے تو پھر پالیٹکس پہ لوٹ آتے ہیں اور جب دونوں بے کار ہو جائیں تو جیوک باکس میں ایک چونی ڈال کر اپنے مطلب کا ریکارڈ سننے لگتے ہیں۔

اپنا اپنا پیار کا سپنا

— آخر باہر چل دیتے ہیں —

کلیان کے پاس ایک پھٹیچر سی گاڑی تھی جس کی بیٹری ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی طرح بات بات پہ ناراض ہو جاتی تھی اور بعض وقت تو کوئی بات بھی نہ ہوتی تھی اور یہ ڈاؤن ا. . . . ایک عجیب طرح کی کلائی میکڑک دور آیا تھا۔ اُس پہ حیف و یف سب ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بے حد چڑچڑی ہو رہی تھی۔ سب کے سامنے اسے سڑک پہ دھکیلتے ہوئے ہم عجیب سے لگتے تھے۔ اس وقت وہ سب کمینے جنھوں نے ہماری طرف دیکھ کر کبھی سر بھی نہ ہلایا تھا، فوراً پہچان جاتے اور آواز دیتے —" ہیلو شرما جی . . . " اور میں جواب میں ان سے وہی سلوک کرتا جو پھٹیچر گاڑی سے پہلے وہ مجھ سے کرتے۔ ایسی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا کہ انھیں واقعی میں کوئی اور دکھائی دینے لگتا۔ اور وہ اس قدر گھبرا جاتے کہ پھر مجھے بھی وہ کوئی اور دکھائی دینے لگتے۔

ہم ابھی دادر ونسٹ روڈ پر سے گزر رہے تھے جبکہ مجھے یاد آیا پروڈیوسر ڈھولکیا نے سویرے ایک لڑکے کی معرفت مجھے بلوا بھیجا تھا۔ امید ایکا ایکی، ہائیڈروجن بم کے مکر ہوتے کی طرح میرے حواس پہ چھا گئی۔ جذبات اور خیالات کا ایک دوسرے پہ سلسلہ وار عمل اور ردِ عمل ہونے لگا۔ جبھی میں نے زور سے آواز دی "روکو کلیانی، گاڑی روکو!"

کلیانی نے حیران ہو کر میری ہنکار کو سُنا۔

رشی ہانپتے ہوئے بولا " تو سمجھتا ہے پہلے چل رہی ہے؟"

داس نے سر ہلا دیا۔ وہ دم لینے کا کوئی بھی بہانہ چاہتا تھا۔

اس لیے پرے چل کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ مُردے کی طرح مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں اور منّت پیدا کی "یار میں بھول ہی گیا.. ڈھولکیا نے بلوایا ہے ... شاید"

"وہ سب بنڈل مارتا ہے" کلیان نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "ہم اس کی پکچر کا فوٹو گرافی کیا ... ایک دم انگلش! .. پھر کیا ہوا؟"

میں نے کلیان کو تسلی دیتے ہوئے کہا "سالا اس کا اپنا فوکس خراب ہے"

ڈھولکیا ایک آنکھ سے کانا تھا،

آپ تو جانتے ہیں۔ بے کار لوگ جتنی جلدی ناراض ہوتے ہیں، اس سے جلدی خوش بھی ہو جاتے ہیں۔ ہنستے ہوئے اس نے گاڑی کا وھیل دادر روڈ کی طرف گھما دیا۔ کچھ دیر میں ہم اسٹوڈیو کے سامنے تھے۔ کلیان نے باقیوں کو روک لیا اور مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔ خود بوٹ اٹھا کر وہ گاڑی میں یوں دھنس گیا کہ باہر صرف دو ٹانگیں دکھائی دینے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بچہ الٹا پیدا ہو رہا ہے۔

میں چاہتا بھی نہ تھا۔ جیگوار، رتی، داس اور کلیان میں سے کوئی میرے ساتھ اسٹوڈیو میں چلے۔ بعض وقت کسی کی ایسی بات بھی ماننا پڑ جاتی ہے جو آدمی ہر کسی کے سامنے نہیں مان سکتا۔ ادھر جب ہر کسی کی پکچر بیٹھ رہی تھی، ڈھولکیا صاحب کی چل نکلی اور اس نے جوبلی منائی۔ اب اسے قابل لوگوں کی ضرورت تھی۔ میں قابل نہ سہی لیکن اوسط درجہ کا آرٹسٹ ضرور تھا... نہیں

نہیں، مجھے میرے اسی انکسار نے مارا ہے، جو اس شو بزنس میں نہیں چلتا. خود اپنا ڈھول پیٹنا پڑتا ہے۔ آخر میرے مقابلے کا کریکٹر ایکٹر اور تھا کون؟ جرنلسٹ پاگل تو نہیں تھے جنھوں نے تصویر ''مہا ملن'' میں ایوارڈ مجھے دلوایا تھا غالباً اسی بات سے مرعوب ہو کر ڈھولکیا نے مجھے بلوایا تھا۔ چونکہ وہ خود ڈھولکیا تھے۔ اس لیے ہر بات میں اپنا ڈھول پیٹنے کے ساتھ بیچ میں کہیں میرا بھی پیٹ ڈالا ہوگا۔

اسٹوڈیو میں پہنچا تو ڈھولکیا صاحب سامنے بیٹھے ہوئے مل گئے۔ وہ اس وقت ایک ایکسٹرا لڑکی کا اس کے سپلائر کے ساتھ جھگڑا چکا رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر لڑکی ایک طرف ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔ ڈھولکیا صاحب ایسے ہی چونکنے ہو گئے۔ ایک خواہ مخواہ کا تناؤ پیدا ہو گیا۔ ایک تیز سی نظر سے سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی پنچ شیل پہ دستخط ہو گئے اور کومل وہاں سے سٹک گئی۔

ڈھولکیا صاحب مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اور میں ان کی باتوں کے بین السطور اپنا مطلب ڈھونڈنے لگا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ بین السطور تو سب دکھائی دینے لگا، سطور گم ہو گئیں۔ آخر پتا چلا ڈھولکیا صاحب نے مجھے کلو کی وادی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے بلوایا ہے۔ جہاں وہ آؤٹ ڈور کے لیے جا رہے تھے۔

''کلو کی وادی بہت خوبصورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کلو'' میں ناشپاتیاں ہوتی ہیں اور سیب ہوتے ہیں۔''

''اور کیا ہوتا ہے؟'' ڈھولکیا صاحب نے پوچھا۔

"اور۔۔۔؟ میں نے کچھ سوتے ہوئے کہا: "کلّو میں سیب اور ناشپاتیاں ہوتی ہیں۔"

— میں دراصل بھول گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ کلّو گئے مجھے پندرہ بیس برس ہو گئے تھے بلکہ اس لیے کہ اس وقت دماغ پہ زور دینے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ مجھے ڈھولکیا صاحب سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ روئے زمین کے کسی آدمی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس پہ بھی میں کہہ رہا تھا اور "کلّو میں پتھریلی زمین ہوتی ہے، جس میں کہیں سے ہریالی پھوٹ نکلتی ہے۔"

ڈھولکیا کو میری ہریالی سے دلچسپی نہ تھی۔

میں نے انھیں بتایا: "وہاں لگڑی — چاولوں کی شراب ہوتی ہے، جسے پی کر مرد اور عورتیں باہر — بازار میں نکل آتے ہیں۔"

"پھر؟۔۔۔ پھر کیا ہوتا ہے؟"

"پھر مرد — عورت کے گلے میں بانہہ ڈال کر جھومنے لگتا ہے۔ ساتھ اس کے گلے میں پڑے ہوئے چنبیلی کے ہار جھومنے لگتے ہیں۔ اور وہ بڑے عاشقانہ انداز سے اس کی نشیلی آنکھوں میں اپنی نشیلی آنکھیں ڈالتا ہوا کہتا ہے "تو میری جوئی — مطلب، بیوی۔"

"مطلب — کسی عورت کے گلے میں بانہہ ڈال کر؟"

"اجی نہیں۔" میں نے کہا: "اپنی بیوی کے۔۔۔"

"او —" اور ڈھولکیا صاحب کچھ مایوس سے نظر آنے لگے۔ عام فلمی کہانی نے ان کے مذاق کو چوپٹ کر دیا تھا اور وہ نا تمام غیر منتج زندگی کے عادی نہ رہے تھے۔ میں نے کہا "کلّو کی لڑکیاں بے حد خوب صورت ہوتی ہیں۔ ڈھولکیا صاحب۔۔۔ ایک

سگریٹ ایک سیٹی ان کے لیے بہت ہوتے ہیں۔" اور پھر سوچتے ہوئے بولا: "یہ جب کی بات ہے، اب تو شاید پورے کارٹن کی ضرورت پڑے یا دس کے نوٹ۔"

ڈھولکیا صاحب نے سر ہلا دیا۔ میں سمجھ گیا۔ فلم میں یا لوا لکھ روپیا بھی کچھ نہیں ہوتا اور یا پھر ایک کھوٹا پیسا بھی بہت بڑی دولت ہوتا ہے۔ ڈھولکیا چونکہ تین تصویریں بنا رہے تھے، اس لیے خرچ ان کی بچت ہو گیا تھا۔ بولے "ہم کلّو میں دسہرے کا سین لیں گے..... وہاں کی سولڑکیوں کے ساتھ... لوکل ٹیلنٹ!"

اور پھر انھوں نے وہ آنکھ ماری جو پہلے ہی مری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں، میں اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ میں آچکا تھا۔ اوپر دیکھا تو سر پہ آسمان ہی نہ تھا۔ کمپاؤنڈ میں ایک فوارہ تھا جس میں کبھی پانی نہ آیا تھا اور اس کے کارن اردگرد کی باڑ خشک ہو چکی تھی اور ہریالی کے بغیر اسٹوڈیو کا پورا منظر ایک کھنڈر ہو چکا تھا۔ کچھ دُور جاکر میرے پیر جیسے اپنے آپ رُک گئے اور میں لوٹ آیا۔ ڈھولکیا صاحب کے پاس پہنچتے ہوئے میں نے کہا "وہ ___ آزادی سے پہلے کی بات تھی ڈھولکیا صاحب! کہیں کوئی کام دلوائیے۔ کوئی چار چھ سین کا رول۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" ڈھولکیا بولے۔ "بیسیوں بار تمھیں بتا چکا ہوں۔"

"کچھ تو بچا ہوگا۔" میں نے یونہی امید کا دھوکا پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ میرے حصے، میری تقدیر کا۔ آپ تو اَن داتا ہیں۔ رائٹر سے کہہ کے ایک آدھ رول بڑھوا دیجیے۔"

ڈھولکیا صاحب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کوئی بہت بُری چیز کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلا دیا۔ اب وہ مجھے دھندلے دھندلے سے نظر آرہے تھے۔ جب بھی میں بولتا گیا" ہمارا کوئی رول نہیں؟.. ... کہیں بھی — ہمارا کوئی رول نہیں؟"

ڈھولکیا صاحب نے ایک غیر یقینی انداز سے میری طرف دیکھا، اور پھر منہ پرے کر لیا۔ ان کا نچلا ہونٹ جو پان کی پیک سے سُرخ اور سیاہ ہو چکا تھا، لٹکا ہوا تھا، اور وہ چھوٹے سے ترمورتی نظر آرہے تھے۔ اس وقت تو وہ تیسرا چہرہ تھے جس پہ قہر کے جذبات ہوتے ہیں۔ ایسے میں شیو جس کی طرف دیکھتے ہیں وہ فنا و برباد ہو جاتا ہے.... میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی قریب نہ تھا، چنانچہ میں نے ان کے پیر پکڑ لیے اور بولا:" آپ جو بھی کہیں گے میں کروں گا ڈھولکیا صاحب..... میں سچ کہتا ہوں، میرے بیوی بچّے بھوکوں مر رہے ہیں — میں مر رہا ہوں"

اس پہ ڈھولکیا صاحب ہنس دیے " مرجاؤ" وہ بولے:" دنیا میں سینکڑوں لوگ روز مرتے ہیں، ایک تم مر گئے تو کیا ہوگا"

" میں مر گیا تو...." میں نے اپنے آپ کو سوچتے ہوئے پایا... " کچھ نہیں ہوگا"

جب تک کومل واپس آچکی تھی، اور ڈھولکیا صاحب اس کا جھگڑا چکانے کے لیے اندر چلے گئے۔

میں باہر چلا آیا اور سوچنے لگا۔ ترمورتی کا ایک چہرہ وہ بھی تو ہے جس میں شیو بھگوان پوری کائنات پہ مسکراتے ہیں۔ جب پودے

کھل اُٹھتے ہیں اور ان کے کاندھوں پہ چھوٹے چھوٹے۔ یونہی ہوائیں دامن میں دونوں جہاں کی دولت لیے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور ان کے کاندھوں پہ چھوٹے چھوٹے بادلوں کی مٹکیاں ہوتی ہیں جن میں صحت کی شراب ہوتی ہے۔ جیسے راستے میں آنے والے ہر چھوٹے بڑے کو پلاتی ہوئی وہ گزرتی جاتی ہیں اور اس وقت ...
.. یہ کس کا کہنا ہے، میں مرجاؤں گا تو کیا ہوگا؟ .... میں بتاتا ہوں کیا ہوگا۔ میری بیوی جو میری وجہ سے کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتی پناہ کے لیے میرے بھائی کے پاس چلی جائے گی۔ اس کے گلے میں رسّی ہوگی اور منہ میں گھاس .... اور میری چھوٹی بھابی اس سے وہ سلوک کرے گی جو کوئی کھاج ماری کتیا سے کرتا ہے۔ میں خود اپنی بیوی سے بدسلوکی کرتا ہوں۔ بہت غصہ آئے تو کچھ کھینچ مارتا ہوں ــــ میں جانور ہوں، لیکن ــ میں اسے خود ماروں گا۔ کاٹ ڈالوں گا۔ مگر کسی دوسرے کو اس کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھانے دوں گا.... اور میرے بچے ــ ڈالی، چنوں ... ان کو بدن سے لگاتا ہوں تو میرا اپنا شریر گدرا جاتا ہے ... معلوم ہوتا ہے، وہ گوشت ہی گوشت ہے، ہڈی اس میں نام کو نہیں .... وہ مرجائیں گے گوشت بھی نہیں رہے گا، ہڈی بھی نہیں رہے گی ....
نہیں میں مرجاؤں گا تو یہ سب میری آنکھوں کے سامنے تو نہ ہوگا..

پندرہ بیس گز کے فاصلے میں آدمی کتنا سوچ سکتا ہے، آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔ میں نے سب پُرانے درشن شاستر اور آج کل کے نئے فلسفے سوچ ڈالے تھے۔ میں نے جیل کی دیواریں سوچ ڈالی تھیں، محلوں کے کنگرے سوچ ڈالے تھے۔

کسی نے گنگا میں ایک ڈبکی لگاتے ہوئے پوری زندگی جی ڈالی تھی، تو میں نے بھی اتنے عرصے میں ایک نہیں کئی زندگیاں جی لی تھیں۔ ایسی زندگیاں جن میں آدمی مرتا نہیں صرف شکل بدل لیتا ہے... پھر یہ موت سے ڈر کیسا تھا؟ میری بیوی... بچے... کسی دوسری شکل میں ان کی بھی شکل دوسری ہو گی!... نہیں میں انھیں انھی شکلوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مادۂ حیات اپنی ان گنت جمع تفریق میں کتنا ہی اپنے آپ کو دُہرائے، کتنا ہی سر کو کیوں نہ پٹکے ایسی پیاری شکلیں پھر نہ بنا سکے گا۔ نہ ایسے ہنسی دیکھنے میں آئے گی نہ ایسی خوشی اور نہ ایسا رونا.... آخر رونا اور پھر رونے والے کو پچکارنے، دلاسا دینے میں بھی تو ایک مزا ہے... لیکن.... کیا آدمی اتنا ہی کٹھور ہو گیا ہے؟ — کہیں کوئی مر جائے، اسے پروا نہیں کیونکہ اس کا حلوہ مانڈا، اس کے بوٹی کباب، شراب اور عورت بنے ہیں۔ میرے دو بچے ہیں۔ ڈالی بڑی لڑکی ہے تین سال کی اور جنوں سال سوا سال کا ہے — بیٹا... پنگوڑے میں پڑا، اونی سوئٹر میں پھنسا ہوا وہ بالکل ایک بلّی کا بچّہ معلوم ہوتا ہے... میری بیوی اسے ڈالی سے زیادہ پیار کرتی ہے اس لیے کہ وہ مقابل کی جنس کا ہے — نر جو میری نسل کو آگے چلائے گا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر میری نسل — ایک بے کار، بے ہودہ آدمی کی نسل.... جنوں کو پیار کرتی ہوئی وہ آدھی پاگل ہو جاتی ہے۔ اسے نہلا دُھلا کر لاتی ہے اور ایک نرم سے تولیے سے اس کا بدن پونچھتی ہے۔ وہ ہنستا روتا، مچلتا ہے اور میری بیوی اسے گدگدی کرتی ہے۔ ایسا کرنے میں اس کے اپنے گدگدی ہونے لگتی ہے۔ میں جو دیکھتا ہوں اس کی بھی گدگدی ہونے لگتی ہے۔ جیسے میری بیوی کی انگلیاں جنوں کے بدن

پہ نہیں، میرے بدن پہ ناچ رہی ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم کیڈل روڈ پہ جا رہے تھے۔ جو لوگ بمبئی کے جغرافیے سے واقف ہیں، جانتے ہیں دادر سے پیر سین ڈیری جانے کے لیے نکلیں، تو کیڈل روڈ راستے پہ نہیں پڑتی۔ ایسے لوگوں کو میں بتا دوں، اگر کسی مرد کا نام کلیان ہو اور اس کی بیوی کا نام راجی... اور درشن نام کی کوئی لڑکی راستے میں آپڑے، تو پھر کیڈل روڈ بھی پڑ سکتی ہے۔ درشن کلیان کی 'وہ' تھی اگرچہ کلیان بے کار تھا، پانچ بچوں کا باپ تھا۔ اس کی گاڑی کھٹارہ تھی، اس پہ بھی درشن کلیان کے لیے — "یہ سب کچھ اور جنت بھی" کا رتبہ رکھتی تھی اور ہم کلیان کو ہمیشہ اس بے راہ روی پہ ڈانٹا کرتے تھے۔ لیکن اس دن مجھے پتا چلا — سب ٹھیک ہے.... اگر وہ سب ٹھیک ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے... کلیان ڈھولکیا کی طرح کا نہ تو ہول سیلر تھا اور نہ کسی کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے والا.... درشن تو ایسے ہی تھی، جیسے راہ جاتے کسی کے گھر میں لگے جھاڑ سے رات کی رانی کی خوشبو آجائے .... انسان کہاں تک اپنی ناک بند کر کے چل سکتا ہے؟... وہ یہ سب کرتا چاہتا ہے اور پھر بیٹھ کر رونا، پچھتانا بھی... اگر وہ روئے پچھتائے نہیں تو ہمارے مندر، ہماری مسجدیں اور گرجے کہاں جائیں؟ کہاں جائیں اسکولوں کے ماسٹر اور قوموں کے راہنما؟..... بڑی بڑی نصیحتیں، لمبے چوڑے بھاشن اور گنجلک فلسفے؟... لیکن ہم ابھی درشن کے فلیٹ پہ پہنچے ہی کہاں تھے — سامنے کسی حادثے کی وجہ سے ٹریفک رک گئی تھی.....

جہاں سے ٹریفک رُکنا شروع ہوئی تھی۔ وہاں کچھ دو منزلہ بسیں کھڑی تھیں۔ آخری بس کے پیچھے ایکسپریس لکھا تھا اور وہ سانتا کروز ڈپو جارہی تھی اس کے پیچھے کچھ کاریں، وین اور ٹھیلے وغیرہ تھے جن میں سے لوگ لپک لپک کر موقع واردات پہ پہنچ رہے تھے کچھ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے ہاں ہاں ٹاں ٹاں کر رہے تھے اور کچھ لوگ اِدھر اُدھر ہو کر نکل جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک گھٹی ہوئی لائن میں پھنس چکے تھے۔ اگر کوئی نکلتا بھی تو مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑیاں اسے جگہ نہ دیتیں۔

کیا ہوا؟ کون ماں کا لال تھا، جو آج بیچ سڑک کے پڑا تھا؟ آج کس کی بیماری کا انتظار صدیوں پہ پھیل گیا تھا؟.... میرا دل ڈوبنے لگا۔

ہم تینوں چاروں گاڑی سے نکل کر لپکے۔ ڈھولکیا کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ایک تم مر گئے تو کیا ہوگا؟... کیا واقعی کچھ نہ ہوگا؟ یہ جو یہاں پڑا ہے اس کے مرنے پہ بھی کچھ نہ ہوگا؟ شاید انسان اتنا ہی سنگ دل ہو گیا ہے.... جب ہی اس نے ایک دوسرے کو تہس نہس کرنے کے لیے اس قدر خوفناک ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں۔ ایسی سنگ دلی اور بے رحمی کے بغیر جن کا استعمال ہی ممکن نہ تھا......

کیا اس بدقسمت کے لیے کوئی نہیں مرے گا؟... کوئی اپنا خون نہیں بہائے گا؟.... انسان کے لیے کوئی امید نہیں....

جب تک ہم موقع پہ پہنچ چکے تھے.... لوگ ہنس رہے تھے — یہ کیسے لوگ تھے!

پھر کچھ اور قہقہے پڑے اور کسی کے پیچھے کی طرف بھاگنے کی

آواز آئی، جیگوار ہم سب سے لمبا تھا۔ بھیڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر اُس نے ایڑیاں اٹھائیں اور سڑک پہ دیکھا۔ اُف! صورت کیسی مسخ ہو چکی ہو گی، بس کے ساتھ ٹکرانے سے چیتھڑے اُڑ چکے ہوں گے اور خون ــــ جبھی جیگوار لوٹا تو وہ بھی ہنس رہا تھا۔ میں بھاگ کر بس کی لینڈنگ پہ جا کھڑا ہو، جہاں سے میں نے دیکھا ــــ

وہ نظارہ میں زندگی بھر نہ بھولوں گا، جس کے دیکھنے کے بعد لوگوں کی زبان پہ قہقہے تھے اور میرے گلے میں آنسو، جن کے بھنور میں ڈھولکیا اور اس کی تماشے کے سب لوگ ڈوب گئے تھے اور جن سے انسان کی معصیت دُھل گئی تھی ــــ ایک بلّی کا بچہ بائیں حصّہ پہ تقریباً سڑک کے بیچ بیٹھا ہوا تھا اور بس کے ڈرائیور کنڈکٹر اور دوسرے لوگ اسے ہٹانے، بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی جگہ پہ گل محمد ہو رہا تھا!

وہ بے حد خوبصورت تھا ــــ بلّی کا بچہ!... مشکل سے دو مہینے کا ہو گا۔ اس کا رنگ سفید تھا جس پہ کہیں کہیں ست۔ بیچ سے چھینٹے دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں پہ دو گہرے نارنجی سے داغ تھے جن میں سے اس کی پیلی، چمکتی ہوئی آنکھیں اور بھی پیلی چمکیلی دکھائی دے رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی عورت کچھ بنتی ہوئی ادھر سے نکلی ہے اور اُس کے پرس یا ٹوکری میں سے اُون کا گولا سڑک پہ گر گیا ہے....

ایک طرف اوٹو ایکسپریس تھی قریباً بارہ فٹ اونچی اور دوسری طرف وہ تھا۔ بلّی کا بچہ! جو اپنے بے بضاعت وجود کے باعث مقابلے میں اور بھی بے بضاعت ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر اسے بچانے، سڑک پر

سے ہٹانے کے لیے بڑھا تو وہ اسی پہ جھپٹ پڑا۔ اس بظاہر بے ضرر، اُون کے گولے میں نہ جانے کہاں سے تیز نوکیلے پنجے نکل آئے ہیں۔ جنھوں نے کنڈکٹر کے ہاتھ پہ خراشیں پیدا کر دیں اور ان میں سے خون کے باریک سے قطرے اُمڈنے لگے اس پہ بھی کنڈکٹر خفا نہیں، اُلٹا ہنس رہا تھا۔

"ہے نا سالا" وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی کی جان بچانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں، اور یہی نہیں جانتا"

"کتنا ناشکرا ہے" ایک عورت نے کہا۔

اور وہ بدستور کھڑا ابھی تک کنڈکٹر کو گھور رہا تھا اور غرّانے کی نقل اُتار رہا تھا۔ جیسے کوئی چیلنج دے رہا ہو۔ "بیٹا پھر تو آؤ!" اور جب کنڈکٹر نے ہمت نہ کی تو وہ پھر تھوڑا پیچھے ہٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور گلاب کی پتی سی زبان نکال کر اپنی پیٹھ چاٹنے لگا۔

ڈرائیور نے کچھ بیزاری کے لہجے میں کنڈکٹر سے کہا۔ "کتنے لیٹ ہو گئے یار" گویا اس خوبصورت حادثے میں بچارے کنڈکٹر کا قصور تھا۔

بس کے بازو میں ایک ٹھیلے والا تھا۔ جس کے ٹھیلے پہ تیزاب کی بڑی بڑی بوتلیں پڑی تھیں۔ گویا ایک طرح کا بارود تھا۔ جو ذرا سی ٹھوکر لگنے پر پھٹ سکتا ہے۔ وہ اپنی گھبراہٹ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ بلّی کے بچے کے پاس پہنچتے ہوئے ٹھیلے والے نے دو ہاتھ اس کی طرف جوڑ دیے اور بولا۔

"اب اُٹھ جا میرے باپ۔۔۔۔ بہت ہو گئی"

اسے آگے بڑھتے دیکھ کر بلّی کا بچہ پھر تننے لگا۔ بھیا ذرا ڈر کر

پیچھے ہٹا تو بلّی کے بچّے نے ایک نہایت ہی لطیف مترنم سی آواز نکالی۔ "میں آؤں"

اس پہ سب ہنس پڑے اور بس کا ڈرائیور بولا۔ "ہاں حضور ــــ آپ آئیے "

جب تک کچھ اور ٹریفک پیچھے رُک گئی تھی اور ڈرائیور لوگ ہارن بجا رہے تھے۔

ایک مرسی ڈیز سے کوئی خوب رو نوجوان نکلا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا منظر پہ چلا آیا۔ پہلے تو وہ بلّی کے بچے کی طرف دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سب کو پیچھے دھکیل کر ایک ٹھڈے سے قصہ ہی پاک کر دینا چاہا۔ جبھی لوگ لپکے ــ "ہے ہے، ہے ہے" کی آواز بلند ہوئی اور وہ خوش پوش نوجوان اپنے جامہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا ــ "کیا بکواس ہے وہ بولا۔ گیارہ بجے میرا جہاز اُڑ جاتا ہے"

لوگ اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اس کی روح بھی اُڑ جائے تو پرواہ نہیں۔ نوجوان نے غصے سے ہاتھ اپنی پتلون میں ٹھونس لیے اور پسپا ہوگیا۔ پھر اپنی اعصاب زدگی میں آگے۔ اور مجبور و مقہور لوٹ گیا۔ بکتا جھکتا ہوا ــ "یہ اسی ملک میں ہوسکتا ہے ... ایک بلّی کا بچّہ اتنے بڑے شہر کی ٹریفک روک سکتا ہے "

ایک نے مسخری کی ــ "پولیس کو بلوائیے صاحب"

نوجوان نے زور سے پیر زمین پر مارا اور بولا۔ "میں ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں ــــ فائر بریگیڈ والوں کو"

اور سب ایک آواز میں ہنس دیے۔جب ہی مجمع میں سے آوازیں آئیں گیا گیا۔"

کسی کو خیال بھی نہ تھا، اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اتنے بڑے مسئلے کا حل یوں ایک پل میں ہو جانے گا۔ بلی کا بچہ جیسے اپنے آپ کسی اندرونی ترغیب سے اُٹھا۔ بیچ میں سے کمر اوپر اُٹھائی، دُم تانی جس کے سرے پہ شربتی رنگ کا ایک بڑا سا گچھا تھا۔ پھر اگلے پنجے آگے رکھے، پچھلے پیچھے اکڑا گلابی سا منہ کھول کر جماہی لی۔ ارد گرد کے پورے منظر کو کچھ تعلق اور کچھ بے تعلقی سے دیکھا اور ایک نہایت ہی سست رفتار میں سڑک کے دائیں طرف چل دیا۔

"وہ گیا نہ ہی بھگوان سے" بس کے ڈرائور نے کہا۔

"وہ گیا۔۔۔ گیا۔۔۔" سب نے تالی بجائی اور ہنستے، کلکاریاں مارتے ہوئے اپنی اپنی گاڑی کی طرف لپکے۔گاڑی کو راستے سے ہٹانے ہوا ہو جانے کے لیے۔ لیکن وہ ــــ بلی کا بچہ، بڑی تمکنت سے چلتا ہوا، اب دائیں طرف تقریباً سڑک کے بیچ پھر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ اب مخالف سمت کی ٹریفک رکنا شروع ہوئی بائیں طرف سے نکل جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

کوئی اس فضول سی زندگی کو روندتا ہوا نکلنا بھی چاہتا تو لوگ اسے روک دیتے اور وہ اپنے سامنے بے شمار زندگیوں کی ایک چٹان سی کھڑی پاتا۔جن کے ہونٹوں پہ کف بھی ہوتا اور ہنسی بھی۔پھر وہی منظر دُہرایا جانے لگا۔

عجیب نادر شاہی تھی ــــ بلی کے بچے کی، اور عجیب تخت طاؤس

تھا اس کا۔

بیٹھنا ہی تھا تو کہیں اور بیٹھتا۔ ۔ ۔ ۔ اتنی جگہ تھی اس کے لیے۔
شاید بلّی کے بچے کا مطلب تھا، دھرتی کے اس حصّے پہ تمھارا حق ہے، تو میرا بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔

— میں اس پہ کھیلوں گا اور وہ کھیلنے لگا وہ تھوڑی سی جست بھرتا۔ اور کچھ خیالی چوہے پکڑ کر پھر وہیں آ بیٹھتا، اور سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا — تم تو دن رات اس پہ چلتے ہو۔ آج میں آ بیٹھا ہوں تو آفت آ گئی۔

تم تو بڑی بڑی مشینوں کے ساتھ دندناتے پھرتے ہو۔ میں چلتا ہوں تو آواز بھی نہیں ہوتی۔ شور روکنے کے لیے پیروں میں گدّے باندھ رکھے ہیں اور یہ ناخن تو صرف بچاؤ کے لیے ہیں ایک رول تمھارا ہے، ایک میرا!

معاملہ مذاق کی حد سے بڑھا جا رہا تھا۔ جب ہی بھیڑ کے بیچ سے کسی بچّے کی آواز آئی۔ ”میرا سوموئ“۔ ۔ ۔ ۔ اب جھلّانے والے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کوئی اتنا امیر ہو گیا ہو، کہ اسے عام آدمی کے خیالات، بلّی کے بچّے کے جذبات کی ذرا بھی پروا نہ ہو، اس لیے جیگوار نے لپک کر بلّی کے بچّے کو کمر سے اٹھا لیا۔ بجلی کی پھرتی کے ساتھ بڑے بڑے ناخن کسی نہ دکھائی دینے والی سے لپکے اور اگلے ہی لمحے جیگوار کی قمیص میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جیگوار نے آمد و رفت کے لیے سڑک خالی کر دی تھی اور گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔

اب جیگوار نٹ پاتھ پہ کھڑا بلّی کے بچّے کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس جانور کے پنجے جیسے اپنے آپ اندر چلے گئے۔ خرخر کی آواز سی اس کے پورے بدن میں سنسنانے لگی۔

جب کلیان نے اپنی کھٹارہ گاڑی کا اسٹارٹر گھمایا تو بلّی کا بچّہ سامنے اپنی گلاب کی پتّی سی زبان سے پشت کو صاف کر رہا تھا۔ جبھی ایک جھٹکے کے ساتھ بچے نے سر اٹھایا۔ ایک جست لی اور نیچے آ رہا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی ــــ منّی پڑوس کی ایک لڑکی مٹّی کی ٹھلیا میں دودھ لے آئی تھی۔ جس میں منہ ڈال کر بلّی کا بچّہ پیٹر پیٹر دودھ پی رہا تھا

سچ! اگر پورے شہر کا ٹریفک رک سکتا ہے تو... تو....

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں۔ ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسے ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بزرگ اور پیشرو مانا اور یوں احترام کرتے ہوئے ٹال دیا۔ کچھ اسی قسم کا سلوک انھوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ ادبی سلسلے میں بارہا میری پیٹھ ٹھونکی، تحریری طور پر مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد ٹکسال باہر کر دیا۔ حال ہی کی بات ہے جبکہ میں نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو بلا تکلف انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تم رہتے کہاں ہو؟"

عباس صاحب کی ہمدمی کا شرف بھی مجھے حاصل نہیں ہوا، جس میں میرا قصور ہے تو ان کا بھی۔ میرے خیال میں انھوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب امتیازی نقطۂ نظر سے نہیں کیا۔ ایک واضح ارادے سے کسی صحیح آدمی کو تو قریب لانے کی کوشش

نہیں کی۔ جی ہاں صحیح آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ خود اپنی طرف ہے تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو نقد و نظر سے عباس صاحب کی بہتری کا سامان کر سکتے تھے اور خود بھی ان سے سیکھ سکتے تھے۔ جو بھی ان کے پاس آیا، انھوں نے آنے دیا۔ یہی نہیں۔ جو ان کے پاس سے گیا اُسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی پیر مغاں تھے اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے حُسن سلوک نے ہمیشہ کے لیے انھیں بنا دیا۔ اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا؛

اس موذب فاصلے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کی ہم مشربی کا فخر حاصل ہے جس سے ہمدمی اور دوستی کہیں دُور کی بات نہیں۔ پھر تھوڑا جاننے والے میں اتنا انکسار تو ہوتا ہے کہ وہ کسی کو جاننے کا حتمی دعوا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی دُور بھی۔ زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر آخر دم تک ایک ہی سی رہی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سے جرائم نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنے فرنیالوجی کے محدود علم کی بنا پہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری اڈیشن کا پیپر بیک ہوں گے۔ اور کچھ نہیں تو پچھلے پچیس برس سے تو میں ان کا مُنھ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ذہنی طور پہ ان کا قد بڑھا ہے،

جسمانی طور پر آپ وہی کے وہی رہے ہیں۔ چہرے پر جس فہم و فراست کے نشان پہلے تھے، وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اُچٹ کر سامنے والے پہ پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی تحریر جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ جو خفگی یا کھسیانے لمحوں میں کچھ اس طرح سے ہلتے ہیں کہ انھیں پھڑ پھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی بے ساختہ ہے مگر ریشمی، جسے استعمال کرتے ہوئے وہ ایکا ایکی رُک جاتے ہیں۔ معتبر آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے!.... سر کے بال پہلے ڈھائی تھے اب دو رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں۔ بلکہ کئی دفعہ میں نے انھیں کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ لباس میں سادگی ہے اور استغنا کا فن بھی۔ ان کی عام نشست و برخاست کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ زندگی میں تاکید تکلفات پر نہیں، کچھ اور ضروری باتوں پر ہے۔ جس میں ادب، صحافت، فلم، سیاست اور دوسری بیسیوں قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انھیں اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان چننے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً عرب جمہوریہ کو چنیں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیروی کریں گے لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے بین گوریَن سے ملے گی۔

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کا حصہ تھے۔ جس کے ایک جلسے میں، مَیں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔

ان دِنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ایئر تھیٹر قائم ہوا تھا جہاں خوب ہی ہنگامہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کچھ نہیں تو اردو کبھی ضرور ہے۔ چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکّے پڑے۔ خیر، دھکّوں کی بات چھوڑیے۔ وہ تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم سب دھکّے کھاتے ہیں۔ کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ۔ ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں مہاکوی ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا تو اس سے بھی بُرا سلوک ہوا۔ بھگدڑ میں سیکڑوں پیروں کے نیچے دَلا گیا۔ جب بھی میں نے یہی سوچا تھا کہ کیا بڑے آدمی کو دیکھنے کے لیے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ باقی کے فضول اور بے کار قسم کے مرد تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے اور سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے، جسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے:
"... اور وہ آزادانہ مہمانوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جلتے رہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا، عباس صاحب کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ ایسا کریں گے تو ان کا اپنا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس عمل میں انھیں کتنا ہی بولنا، کتنا ہی وقت ضائع کرنا پڑا۔ وہ اس بات کو بھول ہی گئے اور آج تک بالعموم بھولے ہوئے ہیں کہ جب تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے، بات کیسے بنے گی؟ (دل بدست آور کہ حج اکبر است!)

جب عباس صاحب کے چہرے پر ایسی ہی طمانیت برستی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ بعد میں وہ "آزاد قلم" ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو "آزاد فلم"۔ ایک نقطہ اور بھی کم۔ ان کے چہرے پر سب سے اوپر عقیل اور آزاد روی کے نقوش تھے۔ اس سے نیچے پی۔ سی۔ جوشی کی پارٹی لائن اور سب سے نیچے مہاتما گاندھی کی "تلاش حق"۔ پوری کی پوری، جو چھٹپٹا کر سب سے اوپر چلی آتی تھی۔

اسی دن مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لیے اس سے ذاتی طور پر مل لینا ضروری ہے۔ اسے چھو کر دیکھنا لابدی ہے چاہے وہ ہاتھ ملانے کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔ صرف اس نے زندگی کے خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت اور ریاضت کی ہے اور ہم نے نہیں کی۔ کریں تو ذہنی طور پر بھی ہم ان سے ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے ذہن میں ایسے آدمی کو کچھ ایسے مافوق الفطرت انتسابات دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں وہ بامن اوتار سو گزا معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے انسان کی تربیت میں دیکھ کر، عام انسانوں کی سی حرکتیں کرتے پا کر ہمارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے جس میں اس بیچارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں، ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ عباس صاحب سے مصافحے کے بعد کم از کم ایک بات کی تسلی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور پر ان کا قد مجھ سے بڑا نہیں۔ البتہ رنگ گورا ہے۔ لیکن کبھی تو افریقی قو میں میرا

ہاتھ پکڑ کر اُٹھیں گی اور گوروں کا جوا اتار پھینکیں گی (چنانچہ آج میری پیشین گوئی کتنی پیغمبرانہ ثابت ہو رہی ہے!)۔۔۔۔ رہی ذہنی قد کی بات تو ورزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی جس کا مجھ پر بہت رُعب پڑا تھا۔ لائم او فلاہرٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ خوبصورت افسانے لکھے تھے، لیکن عباس صاحب کا افسانہ "ابابیل" ان پر بیس تھا۔ جب میں ڈاک خانے میں بابو (بیک نقطہ بیش، یا بو شو دا) تھا اور میرے نزدیک کاؤنٹر پر منی آرڈر بک کروانے والے سے لے کر عباس صاحب تک سب انگریز وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے لکنت سے پٹی زبان میں افسانے کی تعریف شروع کی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر انکسار میں ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے اور میں بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی "ایک پاؤلی چاول" کی بھی تعریف کرنا ہے۔ میں خود بھی اپنے افسانوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں کس قدر گرا پڑا ہوں گا، کہ انکسار ان دنوں میرے لیے بہت بڑی عشرت کی بات تھی، جیسے عباس کی تعریف میرے نزدیک بہانۂ محض تھی۔ اپنی باتیں کرنے کے لیے جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے پتا چلا کہ میرے اس وقت جانے بوجھے بغیر انھوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصہ مجھے بھی دے دیا ہے۔ میں گورا نہیں ہوا تو لمبا ضرور ہو گیا ہوں۔

اور یہ عباس صاحب میں امتیازی بات ہے۔ ادیبوں میں

(میرے سمیت) کم آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں گے اور دوسروں کی زیادہ۔ ایک دوسرا شخص جو لوگوں کو بظاہر "انا" سے معمور معلوم ہوتا ہے، وہ ـــ اوپیندر ناتھ اشک۔ میں جب بھی ان دوستوں سے ملا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ ادب کے آسمان پر کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ یہ اسی کا تذکرہ کرتے ہیں، اس کی چیزیں پڑھ کر سناتے ہیں یا پڑھواتے ہیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے ہیں کہ وہ ستارہ ابھی طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں ڈر محض ڈر کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ چونکہ ڈر کوئی اثباتی جذبہ نہیں، اس لیے یا تو وہ ادیب مجھے تالستائی اور چے خف سے بھی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے اور یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا۔ میری طرح کے جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے اور بھی بہت سے ادیب ہیں لیکن ایک فرق ہے۔ میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں اور اسے دُور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن ان میں سے اکثر جانتے ہیں، نہ کوشش کرتے ہیں۔ خیر، وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے اور میں اپنے آپ سے مایوس نہیں۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور اشک میں انا نہیں۔ ارے صاحب ہے اور بہت ہے۔ لیکن اسی قدر جس قدر اسے تخلیقی عمل کے لیے ہونا چاہیے اور وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے جیسے اکثر لوگوں کا سیکس تمام تر سر میں ہوتا ہے اور ایک معزز خاتون کے مطابق ـــــــ، وہاں نہیں جہاں اسے ہونا

چاہیے۔ عباس صاحب میں انا اتنی ہی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں۔ دوسروں سے الگ، اور دوسروں کے بیچ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ساتھی لکھاڑ ہی بہت ہیں۔

میں نے عباس صاحب کے بہت سے افسانے پڑھے جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گیا۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رائے ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں۔ اس سے بہت بلند ہے جس کی تفصیل یا بحث اس مضمون کا حصہ نہیں۔ . . . عباس صاحب کا افسانہ "بارہ بجے" تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لیے کہ اس سے میرا براہ راست تعلق ہے (اگرچہ میں ڈاڑھی کاٹنے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لیے کہ یہ افسانہ پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھا جن میں سے میں بھی گزرا ہوں اور ریل کی چھت پر ننگے بدن بیٹھ کر تقسیم کے وقت ہندوستان پہنچا ہوں۔ اس افسانے میں عباس صاحب نے اپنے ہی طرز کی حسابی مساوات میں۔ برابر کے سکھ اور مسلمان مارے تھے۔ لیکن اس پر بھی سکھوں کی تسلی نہ ہوئی اور مجھے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں بیان دینا پڑا۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی۔ اب، آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے، ان کی فلمیں دیکھی ہیں آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ میں نے اچھا کیا یا بُرا؟

جب تک عباس انڈین پیپلز تھیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کا کلاسیک "دھرتی کے لال" بنا چکے تھے۔

نہ صرف یہ کہ "دھرتی کے لال" پہلی ہندستانی REAL-ISTIC فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور بیرون ملک کے باشندوں کی توجہ اس المیے کی طرف دلائی جس کا نام اس زمانے کا ہندستان تھا۔ "آجکل" بھی تکمیل پا چکی تھی۔ اس میں بھی عباس صاحب کے ان افسانوں اور ناولوں کی قسم کا ایک پیغام تھا جو تائید کی کثرت سے پیغام نہیں رہ جاتا آدمی کو چڑا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھنا چاہتا۔ "انہونی" پہلی غیر جانبدار فلم تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی۔ عباس صاحب اس کے راہبر تھے اور راہی بھی۔ کبھی انھیں اس تحریک کی زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر کمی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جبکہ غریبوں اور ناداروں کے حق میں ایک مبلغ کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی مینڈیٹ کے مطابق تحریک سے عاق کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ تب میں نے پہلی مرتبہ عباس صاحب کو اس قدر غصے میں دیکھا جب ان کے ہونٹ بھنچ بھی رہے تھے اور پھڑ پھڑا بھی رہے تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ تیز تیز باتیں کیے جا رہے تھے۔ آواز جو پہلے ہی کھسیائی ہوئی تھی اور کھسیا گئی لیکن پانی پت کا ہونے اور اور اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے کے باوجود عباس صاحب کے مُنہ سے ایک بھی گالی نہ نکلی۔ کیونکہ وہ تہذیب کا تقاضا نہ تھا۔

ان دِنوں ہم جوڑ کا رول ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف پلڑا بھاری ہو، جھک جائیں۔ کچھ ہمت اور شخصیت کی کمی اور کچھ ذہنی ابطال۔ بس جو اِسٹالن نے کہہ دیا وہ آسمانی صحیفہ ہے۔ کبھی کبھی محسوس بھی کرتے تھے کہ یہ سیل (CELL) کیا بلا ہے؟ جس میں بیٹھے ہوئے لوگ عالمِ کُل ہیں ہمیں سُنے بغیر ہی ہماری قسمت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے ورنہ آپ تحریک سے خارج، حالانکہ آپ کی تحریک کا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں کم از کم براہ راست نہیں۔ اس پہ طرفہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں بچ بھی نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں، کئی پنچوں کا ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں پنچ پرمیشر ہوتا ہے۔ پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان پنچوں میں ایک ادیب قسم کا آدمی بھی ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جو ادب اور فن اور اس کے عوام کے لیے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب حدیں جانتا ہے اور پھر اس قدر لوچ بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر بھی معافی مانگ سکے.... میں تو اپنی ناسمجھی اور کمزوری کی وجہ سے خائف تھا لیکن دوسرے بھی خاموش تھے جو مجھ سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ عباس صاحب کے مُنہ پر کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کا تذکرہ کر کرکے خوش ہوتے تھے۔ اپنی ہمت پہ خود حیران۔ لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی تحقیق کی بہ نسبت اپنے جذبے پر یقین تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسٹالن سے لے کر کیفی اعظمی تک اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے بلکہ

اس لیے کہ حقیقت پر پہنچنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔ محبت.... جیسے صحیح آدمی کبھی کبھی خود بھی شک اور شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سرکس کے روپ واکر کی طرح زندگی کے رسّے پر اپنے آپ کو فکر اور جذبات کے درمیان متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہرحال اپنے آخری تجزیے میں وہی کسوٹی نسبتاً ٹھیک اُترتی ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر ادب اور سیاست ریاضی کے گنجلک سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان کے سیدھے سادے مسئلوں کی توضیح و تفہیم اسٹالن کے پرجز کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور نہ چاؤ ماؤ کی طرح ہندستان پر حملے کی۔ تاکہ روس کے کان ہوں.... چنانچہ ان سب باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے رستے سے نہ ڈگمگائے۔ لیکن، جب تک، بقول شخصے، بہت سا پانی ہمارے دریاؤں میں بہہ گیا تھا۔

ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ کو ہم آہنگ کرکے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا، بلکہ شور.... عباس صاحب کے کئی افسانے اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو موثر نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو کردار کے اعتبار سے سخت خارجی، ہنگامی پہلو لیے ہوئے۔ جس کے باعث ان کی گونج جلد ہی معدوم ہوجاتی ہے۔ لیکن ان کے مقصد اور دوسروں کے مقصد میں بھی فرق ہے۔ انھوں نے لڑکی کے سہارے تو ایک طرف، لکڑی کے سہارے بھی

انقلاب تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس عمل میں بہت سوں کی طرح منقلب ہوئے ہیں۔ نہ انھوں نے زبان اور جمالیات کو اپنے معنی پہنائے ہیں بلکہ اپنے مقصد کی جستجو میں کچھ یوں سیدھے گئے ہیں کہ اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ نظروں سے راستے کی تزئین کرتے جانا عین فن ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے عباس صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ انھیں ایک کام تھوڑا ہی ہے؛ سیکڑوں ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں اور زمانہ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنسی عمل ہے۔ میں اس بات کو فلسفیانہ سطح پر لاتے ہوئے عرض کروں گا کہ وقت کو تھامنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسے ہمارے بڑوں نے مثنوں کے ذریعے گویائی تھام دی تھی اور یکسوئی اختیار کر کے کالی بھگوان کی مار سے بھی پرے چلے گئے تھے، اسی طرح کا عمل ہمیں بھی روا رکھنا ہوگا۔ ہم ادیبوں کا کا واشاک اور ہمارا راکٹ یہی ہے کہ جس پر سوار ہو کر مہرو ماہ سے بھی اوپر جا سکتے ہیں . . . ایک دن آئے گا جبکہ جدلی مادیات کے دعویداروں کو بھی مقصد کی تحلیل اور اس کے اندرونی تضادات کو خاطر میں لانا پڑے گا۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی بیگم — مرحومہ بھی ایک نہایت ہی پیار کرنے والی عورت تھیں۔ ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ جوہو میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا عباس صاحب

کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی ان کے ہاں رُکتا تو وہ بڑی شکایت کرتیں کہ قریب سے گزر جاتے ہو، آتے تک نہیں۔ ان کی وفات سے ہمیں قلق ہے، تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جنسی زندگی کے بارے میں عباس صاحب کا نظریہ ایک عام، نارمل مہذب آدمی کا نظریہ ہے۔ وہ زندگی کے اس حصے کو بالکل منفرد سمجھتے ہیں۔ انگریزی قول کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے پبلک میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں۔ مطلب اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو۔۔۔۔! (ضرور ہوں گے)

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے، وہ ہے ان کے کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت و قوت۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ قومی یا بین الاقوامی سطح پر فلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ بلٹز کا آخری صفحہ تو بہر حال لکھنا ہی ہے، لیکن ساتھ ہی خروشچوف کی سوانح بھی ہو گئی۔ پنڈت نہرو سے بھی مل آئے جن سے عباس صاحب کے ذاتی مراسم ہیں۔ پھر پینتیس لاکھ کمیٹیوں کا ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات ممبر شپ تک ہی محدود نہیں۔ ہر جگہ پہنچیں گے بھی تقریر بھی کریں گے۔

پورے ہندستان میں مجھے اس قسم کے تین آدمی دکھائی دیتے ہیں ــــ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس۔ جن کی یہ قوت اور استعداد ایک

عام آدمی کی نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک بار عباس صاحب کے سامنے اس حیرت کے جذبے کا اظہار کیا تو انھوں نے معمول کے رسمی انکسار سے ٹال دیا اور بولے "جبھی تو ہر بات میں تیلا پن ہے" اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "آج کل کیا لکھ رہے ہو؟"

بیچ میں کسی نے ٹوک دیا۔ اس لیے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہ دیکھیں جو نمناک ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس برس کا وقفہ آچکا تھا اور میں اپنے بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔

چلتے پھرتے چہرے

اس وقت میں صرف ایک ہی چہرے کی بات کر رہا ہوں جو بہت "چلتا پھرتا ہے"..... اور وہ چہرہ آج کل کے عام نوجوانوں کا ہے.... چنانچہ میرے بیٹے کا بھی۔

اپنے بیٹے کا چہرہ دکھانے کی کوشش میں، اگر کہیں بیچ میں آپ کو میرا چہرہ بھی دکھائی دینے لگے تو بُرا مت مانیے گا۔ کیونکہ میں آخر اسی کا باپ ہوں، اپنے بیٹے پر ہی گیا ہوں۔ چنانچہ جو کچھ بھی آپ کو میرے بیٹے کے خلاف لکھا ہوا معلوم ہوگا وہ دراصل میرے اپنے ہی خلاف ہوگا۔ کیونکہ اسے اس دنیا میں لانے کے علاوہ اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا ذمہ دار میں ہوں۔ البتہ جو اس کے حق میں کہوں گا، وہ میرے بیٹے کی اپنی لیاقت ہوگی۔ جس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں۔

میرے بیٹے کا قد لمبا ہے اور رنگ کسی قدر کھلتا ہوا حالانکہ

میرا قد چھوٹا ہے، اور رنگ بھی پکا۔ اس کی وجہ غالباً میری بیوی ہے جس کے میکے میں سب لوگ لمبے قد کے ہیں اور رنگ کے گورے۔ میاں بیوی کے ملاپ سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس سے کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔ نہ معلوم کیا چیز نکل آئے؟ مثلاً ایکٹرس ہیلن ٹیری نے جارج برنارڈ شا کو لکھا تھا۔ "ہم دونوں کا ملاپ ہو جائے تو اولاد کتنی اچھی ہو؟" جس پر برنارڈ شا نے جواب دیا تھا۔ "مادام بدقسمتی سے اگر بچہ کو شکل میری مل گئی اور عقل آپ کی تو ..... ؟" شا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو ان کا یہ لطیفہ پتا ہوا معلوم ہو تو اندازہ کیجیے۔ اگر بچے کو شکل ہیلن کی اور عقل شا کی مل جاتی تو؟

میرا بیٹا بہت دُبلا ہے۔ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی جیٹ ہوائی جہاز کے بہت ہی قریب نہ چلا جائے یا کوئی میرے بیٹے کے بہت ہی قریب منہ کر کے پھونک نہ مار دے۔ اس کے مہین سے چہرے پر موٹی سی ناک رکھی ہے۔ جو اس بات کے انتظار میں رہتی ہے کہ چہرے کے باقی خدوخال بھی بھر جائیں تاکہ وہ خود معقول معلوم ہو اور بات بات پر اسے لال نہ ہونا پڑے۔ اس وقت میرے بیٹے کے ناک کے نتھنے یونان سے ہندستان تک بھاگ کر آئے ہوئے سکندر کے گھوڑے بوس فیلس کے نتھنوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہیں۔ یا اس وقت کام میں آتے ہیں جب انھیں اپنے مالک کی انا یا وہم کو جتانا ہو، ورنہ وہ تو مہینے میں تین چار بار صرف زکام کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

اس کے زکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوانی میں مجھے بھی اکثر زکام ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ورزش کر کے وقت پر سو کر اور وقت پر جاگ کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اس زکام کو بالکل انقلابی طریقے سے ٹھیک کرتا ہے۔ وہ رات ایک ڈیڑھ بجے تک میکس، یا نیویارک کا ہفتہ وار انگریزی رسالہ "ٹائم" پڑھتا رہتا ہے۔ جس پر اس کا دنیا بھر کے علم کا مدار ہے اور پھر صبح سب سے آخر میں اٹھتا ہے جبکہ اس کے بہن بھائی اسکول وغیرہ جا چکے ہوتے ہیں۔ ماں گھر کا سب کام کر چکی ہوتی ہے اور میرا ایک پیر گھر کے اندر ہوتا ہے اور ایک باہر۔ تب وہ نیند کا ماتا میرے پاس آتا ہے اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اسے دیکھتے ہی پہلے میں سلام کرتا ہوں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بار میں نے اس کو سلام کے سلسلے میں آنا کانی کر دی تو وہ مجھے کبھی سلام نہیں کرے گا۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا۔ میرا سارا دن کڑھتے رہنے کی وجہ سے برباد ہو جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ دنوں کے تسلسل ہی کو زندگی کہتے ہیں۔

میرے بیٹے کے ہونٹ پتلے ہیں اور ٹھوڑی مضبوط جو ایک پکے ارادے کا ثبوت ہے اور جسے وہ اکثر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی ہیں جن سے پاس کا تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور دور کا اتنا بھی نہیں جتنا کوئی صحت مند آدمی، مٹی کا ڈھیلا پھینک سکے۔ اس لیے میرا بیٹا آج کل کے نئے علم کا چشمہ پہنتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر کی بھویں گھنی ہیں جو خلوص کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہ بات نہیں

کہ میرے بیٹے میں خلوص نہیں۔ اس میں خلوص ہے، بہت ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھاتا اور یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کا دل صاف ہو اور اس میں خلوص ہو، پھر بھی وہ دھوکا نہ کھائے؟

میرے بیٹے کا ماتھا چھوٹا ہے، کہتے ہیں ایسی تنگ پیشانی کے لوگ زیادہ بھاگیہ وان نہیں ہوتے۔ جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راک فیلر کے گھر میں پیدا ہونے کی بجائے ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کی ماں کام کر کر کے مری جا رہی ہے، میں مر مر کے کام کرتا جا رہا ہوں اور وہ مزے سے لیٹا ہوا ہے تو مجھے بزرگوں کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ وہ فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ اگر وہ کسی کی بات بیچ میں نہ کاٹے تو اپنے چہرے پر کے رگ و ریشوں کی خفیف سی جنبش سے دوسرے کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ آپ کی بات تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس پر بھی آپ کہتے رہنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے۔ اور یہ اس کی اسی ناطق خاموشی کی وجہ ہے کہ اسے اپنے باپ کو کبھی بیوقوف کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غالباً یہ اس کی بے صبری نہیں، آج کل کی دنیا تیز رفتار ہے جس سے میرا بیٹا مطابقت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا۔ وہ کار بھی چلائے گا تو چالیس پچاس میل کی اسپیڈ پر اور میں بیس پچیس پر ٹریفک ٹوں رہوں گا۔ اس نے کئی ایک ایکسیڈنٹ بھی کیے۔ جن میں سے دو تو بہت قیمتی تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ سو روپے کا تھا اور دوسرا کوئی بارہ ساڑھے بارہ سو کا۔ اور اس پہ

بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے اس بات پر شرمندہ نہ کرے کہ میں اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ میں حسبِ معمول سلو اسپیڈ میں تھا۔ اچانک، پیچھے سے کوئی بچہ بھاگ کر آیا۔ اسے کار کا دھکا لگا تو فٹ پاتھ پر جا گرا۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کی جان بچ گئی اور ساتھ ہی ہماری بھی۔ ہسپتال سے اسے مرہم پٹی کروانے کے بعد ہم گھر کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "دیکھا میں تمھاری اسپیڈ پر ہوتا تو بچہ مرگیا ہوتا۔"

"آپ میری اسپیڈ پر ہوتے" میرے بیٹے نے کہا "تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے۔"

یہ شاید خلیل جبران نے کہا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اپنا جسم اور ذہن دے سکتے ہیں۔ اپنے خیالات نہیں دے سکتے۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والوں نے بڑی گڑبڑ کی ہے۔ وہ الفاظ میں حقیقت کا ایک ایک لمحہ جکڑ لیتے ہیں۔ اس وقت آدمی یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کی ہر چیز ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی حقیقتِ مطلق نہیں۔ حقیقت ایک مقامی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کاہلی پسند، کُند ذہن اس وقت پڑھنا اور سوچنا بند کر دیتا ہے اور اس محدود حقیقت کو دنیا بھر پر پھیلاتا رہتا ہے۔

کوئی خلیل جبران سے پوچھے "کیوں بھئی۔ ہم اُنھیں اپنے خیالات کیوں نہیں دے سکتے؟"

پھر کیوں ہمیں کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کو بچوں کے سامنے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیے۔ حالانکہ یہی فطری جھگڑا ہے۔ جسے دیکھ کر بچے کو سمجھنا چاہیے کہ زندگی صرف قلاقند ہی نہیں، کونین کی گولی بھی ہے۔ اور اس آدمی کا آپ کیا کریں گے، جس نے کبھی کبھی بچے کو ماں باپ کا ننگا بدن دکھانے کی سفارش کی ہے۔ یہ خارجی زندگی ہے جو "بچے" کے خیالات کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر اس کی "پرینا" کا حصہ ہو جاتی ہے۔ آج کل کے "بچے" کانوں اور آنکھوں کے ذریعے سے ہزاروں آوازوں اور تصوّرات کو اپنے دل میں اُتار لیتے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ میں جان سکتا ہوں۔ آج کا بچہ اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اسے کوئی جنم دے گیا تھا یا وہ برسات کے پہلے قطرے کے ساتھ اس دھرتی پہ ٹپکا تھا۔ وہ اپنے بڑوں سے اپنی اور ان کی پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے اور رسمی جواب حاصل کر کے چپکے سے قلم اُٹھاتا ہے اور اپنے جوابی مضمون میں لکھتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پورے خاندان میں چار پشت سے کوئی بھی قدرتی طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔

در اصل کرشن دیپاس سے لے کر وشنو پربھاکر تک سب لکھنے والوں نے گڑبڑ کی ہے۔ وہ اس زمانے سے اتنا ہی پیچھے ہیں، جتنا زمانہ ان سے آگے ہے۔ چلیے وقت کے اعتبار سے ہی سہی، مانیے ہم نے سب کچھ پایا ہی نہیں، کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن اس کھونے میں جو کچھ ہم نے پایا ہے، اُسے کالی داس، بھوبھوتی اور شیکسپیر آج نہ پا سکیں گے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ

مجھے اتنا تاؤ نہ دیجیے کہ میں ان بڑے لوگوں کو آج کے نقطۂ نظر سے دیکھوں میں کس قدر بے بضاعت ہوں، ان مہان ہستیوں کے مقابلے میں۔ لیکن آج کے نوجوان کو میرا یہی مشورہ ہے کہ مجھے پڑھیں اور پھینک دیں اور واقعی کسی نامحسوس دلیل کی بنا پر مکمل طور پر رد کر دیں اور میں یہ محسوس کروں۔ میرا بیٹا بھی ٹھیک ہے اور میں بھی غلط ہوں!

میرا بیٹا میری اتھارٹی کو نہیں مانتا، کسی کی اتھارٹی کو بھی نہیں مانتا۔ میں روتا ہوں۔ میرے بڑوں اور پیشروؤں کی روحیں کسی آسمان میں کلبلاتی ہیں اور وہ میرے ساتھ مل کر اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے زمانے میں انقلابی تھے اور انھوں نے اتھارٹی کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے کڑی مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ کیونکہ ان کے زمانے میں بھی ہماری ہی طرح کے ماں باپ تھے، حاکم تھے۔ مذہبی پیشوا تھے۔ انھوں نے بھی وقت کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور نئے اخلاق کو دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا! آپ اندازہ تو کیجیے کہ میرے بیٹے کو کن چیزوں سے نبٹنا پڑتا ہے، زندگی کی رفتار سے، قدم قدم پر ایک کڑے مقابلے سے، مادّی اور روحانی قدروں کی کشاکش سے، پرانے اور نئے کے جھگڑوں سے ــــ میں نے اگر بہت پڑھا بھی ہے تو میرا ذہن جاگیردارانہ ہے لیکن میرے بیٹے کا نہیں۔ میں ایک خاص قسم کا ادب اور متابعت اس سے مانگتا ہوں جو وہ مجھے نہیں دے سکتا اور دینا بھی نہیں چاہتا۔ میں جب اس کی طرف

دیکھتے ہوئے جھلا کر کہتا ہوں۔ تم آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے، تو میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہی فقرہ مجھے بھی میرے ماں باپ نے کہا تھا۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں سرطان (کینسر) صرف ایک پھوڑا تھا جس پر کوئی مرہم لگایا جاتا تھا اور مصفیٔ خون کی بوتل پینی پڑتی تھی۔ ان کے زمانے میں دباؤ اتنے نہ تھے کہ انسانی شخصیت ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح نظر آئے ـــــ جب "سکزوفیرنا" کا لفظ ایجاد نہ ہوا تھا۔ خواب آور گولیاں استعمال نہ ہوتی تھیں اور نہ لوگوں کو ایل۔ ایس۔ ڈی چوبیں یا اُس کھمبے کا پتا تھا جس کا رس پی کر۔۔۔۔ انسان کو اپنا ہی لطیف جسم گہرائیوں میں اُترتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن بے حد حسین سبزہ زاروں میں وہ جاتا ہے، وہ انسان کے اپنے دماغ اور اس کے شعور کی تہیں ہیں جن میں سیلا کانٹ مچھلی سے لے کر آئنسٹائن تک کے سب تجربات چھپے پڑے ہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمارے رشی منیوں نے ہزاروں سال تپسیا کی۔

یہ کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا، ایک حقیقت ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ یونہی میں نے اپنے آپ کو صِفر کرنے کی کوشش کی ہے تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ اگر میں جانتا بھی ہوں کہ سوئز کی نہر فرانسیسی انجینئر ڈی لیلیس نے بنائی تھی تو بھی میں اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب کچھ اس انداز سے دوں گا جس سے اس کی تسلی نہ ہوگی اور میں اس بات کو چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں بھی

سب باپوں کی طرح جاہل ہوں۔ اور میرا زمانہ لد گیا ہے۔ میری حیثیت اس وقت اس "ڈیڈی" کی طرح ہو گی جس سے بیٹے نے پوچھا، "ڈیڈی! یہ مصر کے مینار کیوں بنائے گئے ہیں؟"

"خدا معلوم۔ بس بنا دیے، اگلے وقتوں میں بہت زیادہ وقت تھا لوگوں کے پاس!"

"زرّاف کی گردن اتنی لمبی کیوں ہے ڈیڈی؟"

"بھائی کسی جانور کی لمبی ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی۔"

"ڈیڈی! بچّہ صرف عورت ہی کو کیوں پیدا ہوتا ہے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر مرد کو بچّہ پیدا ہونے لگے تو پھر وہ عورت نہ ہو جائے!"

"ڈیڈی! اگر آپ میرے سوالوں سے خفا ہوتے ہیں تو میں نہ پوچھوں۔"

"نہیں نہیں پوچھو بیٹا، سوال نہیں پوچھو گے تو علم کیسے ہو گا؟"

میرا بیٹا رات کو کیا سوچتا رہتا ہے؟ کیوں رات دیر تک اسے نیند نہیں آتی؟ کیا صرف روغن بادام یا خواب آور گولیاں ہی اس کا علاج ہیں؟ کیا اُسے سیکس ستاتا ہے؟ کیونکہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہو چکی ہے اور اس کے چند مطالبے جائز ہیں۔ پھر اس نے شادی سے کیوں انکار کر دیا۔ کیا صرف اس لیے کہ جب تک وہ اس دنیا کی تگ و دو میں اپنا مقام نہ بنائے گا، کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہ کرے گا؟ کیوں ہمارے زمانے میں لوگ اس عقیدے پر شادی کرایا کرتے تھے کہ عورت لکشمی

ہوتی ہے ؟ اس کے آنے سے قسمت کے دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں۔ اکثر وہ نہیں کھلتے تھے، صرف چند تاریک مستقبل والے بچے اس دنیا میں چلے آتے۔

میرے بیٹے کے خیالات کیا ہیں ؟ میں ان تک پہنچنے کی کوشش تو کروں۔ اس کی روح میں اُتر کر دیکھوں کہ وہ کیوں اتنا خود غرض ہوگیا ہے ؟ کیوں وہ دوسرے کسی کے باپ کے پیر بھی چھوتا ہے لیکن صبح اُٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ دوسرے کا باپ امیر کبیر ہے اور اس نے اپنے بیٹوں کو دولت اور شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بیٹے کے باپ نے چند کالے صفحوں کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا۔ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بیٹا بھی راتوں رات لکھ پتی ہو جانا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پیسا کمانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک ردّے پر دوسرا ردّا رکھنا پڑتا ہے ؟ جیسے وہ مذہب اور دوسری رسوم وروایات کا قائل نہیں۔ وہ گرد و پیش کی دنیا کو دیکھ کر اس قسم کی محنت کا بھی قائل نہیں، ایسے نظام کا بھی قائل نہیں جس میں کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور کچھ عیش کرتے ہیں اور کھُلے بندوں کہتے ہیں۔ بزنس میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے

میں سمجھتا ہوں۔ میرا بیٹا میرا نام استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی شرم نہیں سمجھتا۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجبور اور شرمسار ہے۔ میری وجہ سے وہ

کسی سے دس روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔
میں نے ہنسی کی آڑ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہا۔
"بیٹا تو پھر تم سَو مانگا کرو۔"
اور مجھے پتا چلا کہ وہ میری زندگی میں سے جذباتیت اور مثالیت کو یکسر نکال دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے باپ کی اتنی حیثیت تو ہو جائے کہ وہ کسی سے لاکھ دو لاکھ مانگ سکے جس سے وہ ایک فلم بنائے اور اس سے کئی لاکھ کمائے۔
اس قسم کی مادّہ پرستی، خود غرضی، سگریٹ، شراب، عورت کی وجہ سے باپ اپنے بیٹوں کو اپنی زمین جایداد سے برطرف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مادّی معنوں میں میرے پاس ہے ہی کیا، جس سے بیٹے کو برطرف کر دوں؟ اگر وہ کسی بات سے ناراض ہو کر چلا جائے تو پھر میں ہی اُسے ڈھونڈتا پھروں گا اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو وہ مجھے نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لیے میں سخت وحشت کے لمحوں میں بھی چپکے سے گھر چلا آتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کہیں چلا نہ جائے۔ میں اسے برطرف کرنے کی نہیں سوچتا۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے انسانی اصول کے کلبلاتے ہوئے درخشاں مستقبل سے برطرف نہ کر دے۔

بیوی یا بیماری

جب سے دنیا بنی ہے بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصے میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی ۔ ہے !

بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنے شوہر کو بتاتی ہیں ورنہ نائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی امید اور خوشی میں ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سسرال کی چوکھٹ پر پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نوآموز (شوہر) دولھا دلھن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جو اس کے بھوہڑپنے پہ خوب ہنستی ہیں۔ چونکہ اُسے کسی دوسرے کا منھ تو ملتا نہیں

اس لیے اپنا سا مُنّہ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دِنوں میں میاں کو پکّا کرنے کے لیے بیوی تندرستی کے دن یعنی کنوار پنے اور میکے کو یاد کر کے رونے لگتی ہے۔ جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ کبھی دولھا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبّی نقطۂ نظر سے — CLINICALLY بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اُسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لاکر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اُس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہے۔ بُرے بُرے منہ بناتی ہے، میاں پیار کا دھوکا دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں وہ فو فو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے آدھی باہر گرتی ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد جناب بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے "اے تمھارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں گی" اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا، یا ہرے رنگ

کا جھوٹ سمجھیں، ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں، یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں کسی دوسرے کی نہ سُنیں تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہوتا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دُکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام ہے اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں "مرد ہے!" اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی، لیکن اندر سے کہیں گی۔ "زنخا ہے موا"

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو اُکسانے کے لیے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہو گی تو روز سویرے اُٹھ کر شکایت کرے گی "آج میرا سر کچھ بھاری ہے" پھر وہ ناک سکیڑے گی، ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لے گی اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں آپ بڑی محبت، جو لفظ اُردو میں لکھتے وقت حجّت معلوم ہونے لگتا ہے، کے ساتھ کہیں گے "دوا ہو ایسپرین ہے گھر میں؟" چنانچہ ایسپرین

ہو گی۔ کوڈا پاٹرین بھی ہو گی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔ آپ سوچنے لگیں گے۔ ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مصر ہوتی ہے۔ یاد رہے۔ یہ عورت کے بدن کا وہ حصہ ہے، جس پر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور تعلّی کے مضمون میں اسے نازک پتلا ہونا تو کیا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کمرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصوّر کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصے سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے۔ مگر کمر سے نہیں کیونکہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے بہرحال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوانٹی فلاجسٹین اثر نہیں کرتا اور نہ دردِ شقیقہ و عصابہ (NERVOLGIA) دُور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک، آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں ــــ "بنّو! آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو" پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر درد کے لیے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی۔

میں جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری یہ

ہنسنا اچھی بات نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جیوتشی ہے۔ رمّال ہے یا ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی بیماری کے ایام میں میاں جنت اور دوزخ کے بیچ عالم برزخ میں کہیں اُلٹا لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہیں دل کو کریدو تو ایک ہنسی ہے جو اس کان سے اُس کان تک پھیلتی جا رہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ، نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ ہے کہ مسکت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے۔ "ہائے میں مرگئی" لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ اگر اس نے کہا۔ "میں مرگیا۔" تو وہ سچ مچ مرجا۔۔۔ گا! جلدی یا آسانی سے مرجانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لیے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پُرپیچ جنسی سلسلے کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لیے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یونہی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں چاہتیں اسی لیے وہ مرد کے رنڈوا

ہو جانے کو اپنے بیوہ ہو جانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔
بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی، بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے حد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا "اب کتنے مہینے رہ گئے؟"۔ تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیے۔ گویا عورتوں کی زبان میں اس ابجد کا کوئی دخل نہیں، جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خطِ تصویری (HIEROGLYPHICS) سے ملتی جلتی ہے جسے مصر کے لوگ تو کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔
ہمارے ہندستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر خصلت ایک

دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔ جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور ناقابل علاج ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامتِ اعمال عیادت کے لیے چلے بھی جائیں تو آپ صاحبِ خانہ سے پوچھتے ہیں "کیسی طبیعت ہے۔ گھر میں؟"

"اب تو اچھی ہے، بھگوان کی دیا سے"۔

"کیا تکلیف تھی؟"

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں، جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کے چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے۔ البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے "زنانہ تکلیف ..." مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجیے۔ آپ کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اُس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اُٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے، مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو "بکواس

بند کر،" کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہوگی جو مہینے میں چند دن بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں۔ دنیا جہان کی، جملہ بیوی جات کا قصہ ہے۔ ان ایام میں وہ کچھ یوں لیٹی ہوں گی جیسے اُنھیں ہیضہ ہو گیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آ رہی ہیں۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں۔ گری گدھے پر سے ہیں اور غصہ کمھار پر اُتار رہی ہیں جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے، اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے۔ اگر کسی مہینے یہ چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹی کھٹی ڈکاریں آئیں گی۔ سر چکرائے گا۔ اُبکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف اس بیماری پر غصہ آئے گا۔ دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا، مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہوگا اور تلافیِ مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا۔ جنھیں لے کر بیوی خوش تو ہوگی مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لیے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی جو لکڑی کا نہیں

نسیان کا بنا ہوتا ہے۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ گول گپے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹی کھائے گی۔ مرد کو جب بری بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے۔ لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی۔ اگر میاں خفا کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیماری میں پھر میاں کے لیے تھوڑی سی تسکین کی گنجائش ہے لیکن دوسری میں یکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پر الٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے، دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ منہگائی کا زمانہ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے۔ نہ اٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں ــــ یہاں کے لیے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اُس کے پاس

ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں؛ بیوی جو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے ٹھوٹھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے۔ "IT'S A BOY" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے۔ CONGRATULA-TIONS" اس سے پہلے کہ میاں بیوی کی حالت پوچھ سکے، نرس جا چکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا سارا اندرابل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے؟ ہنسے یا روئے؟ وہ ہنس اس لیے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لیے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہو گیا۔ جو بڑا ہو کر ضرور محبت میں مبتلا ہو گا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ چنانچہ اس وقت میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پر کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "اس دُکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے؟" لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے۔ اس لیے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے

وہ کوئی اور ہی پیکیٹ کھولتا ہے جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساری نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبیہ جس میں سے طلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبت اور تاسف کے آنسو لیے ایک اُلٹی رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پہ باندھ دیتا ہے اور ساری اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"رتو یہ رشوت ہے، مول نہیں"

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دل کش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ جوار گٹ اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے سے جسے بیوی کہتے ہیں، محبت کرتے چلے جاتے ہیں اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ جس میں ایک بیوی اپنے نکمے، نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات اُلٹ جاتی ہے۔ بجنسہٖ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرشام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ساتھ ہوا تھا ۔

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

مہمان

مَیں شروع ہی میں مانے لیتا ہوں کہ مجھے مہمانوں سے نفرت ہے
سخت نفرت!

اگرچہ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں لیکن یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ ہماری سبھیتا میں مہمان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ یہ تو مہمان کی اپنی بدکرداریوں اور اس کے نام میں لگی ہوئی فالتو سی 'م' نے گڑ بڑ کر دی، ورنہ وہ تھا ہی مہمان۔۔۔ آپ ذرا اسے لکھ کر تو دیکھیے۔

اتھتی ستکار کا ہماری پستکوں میں بڑا مہتو ہے۔ جگہ جگہ اس بات کی پریرنا کی گئی ہے کہ مہمان کیسا بھی ہو، اُسے بھگوان کر کے مانا جائے۔ اس زمانے میں شاید خیالات کی زیادتی تھی یا سوچ بچار کی کمی کہ اُن درشن شاستروں کے لکھنے والے گھوم گھام کر پھر شبد مہمان پہ چلے آتے تھے غالباً وہ سب اس لیے کرتے تھے کہ خود ان کے پاس پہننے کو لنگوٹی تھی اور نہ کھانے کو روٹی اور

وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کو کسی کا مہمان ہونا ہی پڑے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ مہمان کا درجہ بھگوان کا ہے تو میں بڑی نمرتا سے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ مجھے بھگوان سے بھی نفرت ہے!

جس زمانے میں ہمارے شاستر لکھے گئے تھے، اس زمانے میں جگہ کی کیا کمی تھی؟ سوائے وشالتا کے اور تھا ہی کیا؟ نیچے زمین، اوپر آسمان اور بیچ میں مہمان، چاہے درجنوں لٹک جائیں۔ آج کس کے پاس ۱۰×۱۰ فٹ سے بڑا کمرہ ہے؟

شامت اعمال اگر مہمان چھ فٹ کا آجائے تو آپ کو ٹانگیں سکیڑ کر انھیں چھاتی سے لگا کر باقی کے چار فٹ میں گزارا کرنا پڑے گا۔ حالانکہ مرنے کے لیے بھی آدمی کو کم سے کم چھ فٹ جگہ چاہیے، جس میں کہ مہمان پڑا ہوتا ہے .... صبح اٹھیں گے تو آپ کی ٹانگیں چھاتی کے ساتھ ہی لگی رہ جائیں گی اور جب انھیں پھیلانے کی کوشش کریں گے تو یوں لگے گا جیسے آپ پھر سے پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں ہمارا پورا فلسفہ مہمان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جب لوگ جنگل میں جا کر کند مول وغیرہ کھا لیتے تھے اور اسی میں سنتشٹ ہو جاتے تھے لیکن آج کا دُشٹ مہمان چکن روسٹ سے کم بات ہی نہیں کرتا۔ کچھ اس انداز سے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو کوالٹی ریستوران میں بیٹھے ہوئے پاتے ہیں۔ آخر دم تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ بل وہ دینے والے

ہیں — یہ مسئلہ آپ کا ہے، مہمان کا نہیں کہ ڈیش بھر میں کھانے کو نہیں۔ راشننگ کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے۔ بیوی کی شکل دُکان پہ کھڑے کھڑے کیو سی ہو گئی ہے۔ پھر پُرانے زمانے میں انسان زیادہ تھے اور مہمان کہیں اِکا دُکا ملتا تھا۔ لیکن آج مال تھوسی کے عقیدے کے مطابق، اِس بُھوکی ننگی دنیا میں مہمان ہی مہمان رہ گئے۔ انسان کہاں نظر آتا ہے؟ اس زمانے کے مہمانوں میں پھر کوئی آنکھ کی شرم تھی، حیا تھی، دوسرے کی تکلیف کا احساس تھا۔ لیکن آج کل کے مہمان؟ ارے توبہ۔ آپ تو انھیں مجھ سے بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ہندستان میں کوئی ایسا آدمی نہیں جسے اس موذی سے پالا نہ پڑا ہو۔ وہ موت کی طرح سے ہر ایک پہ آتا ہے۔ جینا جھوٹ ہے اور مرنا بھی جھوٹ۔ صرف مہمان سچ ہے۔ آج کل کے مہمان کو تو بس گولی ماریے۔ ذرا سوچیے تو، ہم خود خود اس دنیا میں کُل دو ہی دن کے مہمان ہیں اپنے اوپر ایک اور مہمان کو لے آئیں جو مہینے بھر سے پہلے جانے کا نام ہی نہ لے؟ نا صاحب۔ گھر میں مہمان لانے سے تو اپنی بیوی پہ سوت لے آنا اچھا۔

اس دنیا میں تکلف کی بھی ایک جگہ ہے۔ مثلاً آپ کسی کے گھر کھانا کھائیں تو شوربے میں ڈوبے ہوئے دو آلوؤں کے بارے میں ضرور کہنا پڑے گا۔ واہ صاحب مزا آ گیا۔ برسوں کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے۔ یا رُخصت ہوتے ہوئے اپنے میزبان کی بیوی کے بارے میں کہنا ہوگا۔ آپ کی بیوی بڑی

CHARMING ہے۔ سمجھ دار میاں تو اس بات کو سمجھتا ہے
وہ صرف ایک بار مُڑ کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اور پھر گھبرا کر بوٹ
کے تسمے بند کرنے لگتا ہے۔ لیکن مہمان؟ آپ کہیں غلطی سے
بھی اسے کہہ دیں۔ آپ غریب خانے پر تشریف لے چلیے، وہ
آپ کا اپنا ہی گھر ہے تو پھر دیکھیے کیسے وہ آپ کے ہاں انتقال
فرما جاتے ہیں اور وہیں اپنی قبر بنا کر رہتے ہیں۔ آپ کو آپ
کی بیوی کو، آپ کے بچّوں کو مجاور بنا کر چھوڑتے ہیں۔ کچھ دنوں کے
بعد آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے ہی گھر میں مہمان
ہو گئے۔ میزبان تو وہ ہیں، بذاتِ خود!

اپنے دل میں پھر سے گھر کا احساس جگانے کے لیے آپ کے
پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگلے پھیرے میں آپ
اس کے گھر میں مہمان ہو جائیں اور ہر بات میں ان کی جھونپڑی
کو بار بار دولت خانہ کہیں "وہ تشریف رکھیے"۔۔۔ "پہلے آپ"
اور اس قسم کے جملوں کا آزادانہ استعمال کریں۔ پھر ایک اور
بات جو ان سے سہواً چھوٹ گئی۔ اس کی بیوی سے عشق بھی کریں
اس لیے نہیں کہ آپ کا جی چاہے گا، بلکہ اس لیے کہ اس کمینے
کو پتا تو چلے کہ کسی دوسرے کے گھر میں مہمان کیسے ہوا
جاتا ہے؟

بمبئی کے فلیٹوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔
سالے بہت ہی فلیٹ ہیں۔ ان میں اگر آپ ایک چارپائی
رکھ دیں تو دو پائے والے کے لیے کہیں کوئی گنجائش نہیں۔

آخر چارپائی تک پہنچنے کے لیے تھوڑی جگہ تو چاہیے ہی۔ بہرحال وہ کھاٹ جسے آپ کی بیوی جہیز میں لائی تھی اور جسے آپ پلنگ نہ کہیں تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ مہمان کو دینا پڑتی ہے اور خود نیچے سونا پڑتا ہے بدقسمتی سے اگر آپ کے مہمان ساتھ اپنی بیوی کو بھی لائے ہوں تو پھر آپ اوپر سو سکتے ہیں، نہ نیچے۔ ہاں، تو جب آپ مہمان صاحب کو چارپائی پر سونے کے لیے کہیں گے تو پہلے وہ ضرور کہے گا۔ نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ پلنگ پر سوئیے، میں نیچے سو جاتا ہوں لیکن اس کی نیت ہرگز ایسی نہ ہو گی۔ وہ جانتا ہے ناکہ اس کی خاطر کر کے میزبان اپنے کرتویہ ہی کا تو پالن کر رہا ہے۔ اُس کی اس پیش کش سے انکار کیا تو بے چارے میزبان کے دل پر کیا بیتے گی؟ چنانچہ وہ پلنگ پر ٹانگیں پھیلا کر مزے سے سو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو یوں لگے گا جیسے دشمن کا ریڈیو براڈکاسٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کوڈ نہ جاننے کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کو اچانک خیال آئے گا۔ نہیں بھائی، اس WAVE LENGTH پر تو پہلے ہی بیسیوں نشریات سن چکے ہیں۔ یہ تو مہمان کے خراٹے ہیں۔

چنانچہ مہمان صاحب سو رہے ہیں۔ ہمیشہ کی نیند نہیں۔ صبح وہ پھر جگ جائیں گے۔ ایک نہیں نیند آتی تو آپ کو اور آپ کی بیوی کو جو سوچ رہے ہیں کہ کل ان کو کیا کھلائیں گے؟ آپ سوچتے تو نیلا تھوتھا ہیں اور لاتے سیب ہیں، جن کا منہ بھی منہگائی

کے اس زمانے میں آپ نے مہینوں سے نہیں دیکھا۔ پھل بیچنے والا پیشہ ور آدمی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہے اور اتھتی ستکار کی بھاونا ان کے من میں ویاکل ہو اُٹھی ہے۔ چنانچہ وہ سیب تو ایک دیتا ہے اور روپے دو مانگتا ہے۔ جیسے اکیلا وہی ایک سیب ہے جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کشمیر سے آیا ہے۔ پھر آپ آم خریدنے کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ مقابلہ میں سستا پڑتا ہے۔ گھر پہنچ کر آپ اس آم کی بہت سی قاشیں کاٹ کر مہمان کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ اُنھیں ایک کے دو معلوم ہوں۔ مہمان ایک بار پھر آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ چنانچہ لپڑ چپڑ وہ سارے کا سارا آم چٹ کر جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں، شاید وہ سمجھ رہا ہے کہ اندر اور بھی بہت سے آم ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اندر صرف بیوی ہے جو غصّے سے کانپ رہی ہے اور اس کی شکل اُنناس کی سی ہو گئی ہے۔

مہمان کے گھر میں آنے سے سب سے بڑی بے ہودگی جو ہوتی ہے، وہ آپ کے سب راز، سب پول کھل جانا۔ آپ گھر میں آدھی کھائیں یا ساری، یا بھوکے ہی سو رہیں، لیکن مہمان کے آتے ہی آپ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ آپ کتنا ہی اس سے چھپانے کی کوشش کریں مگر وہ سب ایسے ہی بے کار ہے جیسے کارک کو پانی میں ڈبونے کی کوشش۔ مہمان اس وقت اندر سے خوش لیکن باہر سے اُداس دکھائی دیتا ہے اور اکثر

یہ جملہ کہتا ہے — "کیا ہوا بھائی، گھروں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔"
وہ ہمدردی کر رہا ہے جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہیں، جب تک آپ پڑوس سے سو روپے کا نوٹ پکڑ سکتے ہیں، اپنی گھڑی بیچ سکتے ہیں، بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ سکتے ہیں کسی کو ہمدردی جتانے کا کیا حق ہے؟ اگر آپ کسی نہ کسی طرح حقیقتِ حال چھپانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر مہمان بڑے شاطرانہ انداز میں کُریدنے کی کوشش کرتا ہے۔

"کیوں بھائی! کاروبار کا کیا حال ہے؟"

آپ جواب دیتے ہیں — "اچھا ہے۔"

"کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی؟"

"ہوئی کیوں نہیں؟ .... ہر سال ہوتی ہے، جیسے ہر معقول ہندستانی عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہے — ہی۔"

چنانچہ ہنسی میں بہہ جانے کی وجہ سے آپ کو بالکل اندازہ نہیں رہتا کہ آپ کیسے دھیرے دھیرے مہمان کی سازش میں آ رہے ہیں۔ وہ آپ کے بھونڈے مذاق پر آپ سے کہیں زیادہ ہنستا ہے اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے اور پھر ایکا ایکی آپ کو پورے طور پہ نہ دیکھتے ہوئے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چھوڑتا ہے — "اب تو تنخواہ تین سو روپے مہینہ ہو گئی ہوگی؟"

آپ کی رگِ حمیت ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ آپ اپنے آپ کو کہتے ہوئے پاتے ہیں — "تین سو؟ پانچ سو تو میری پچھلے برس تھی —" تبھی آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ نے کیا حماقت کی۔ خود کو کنوئیں میں گرا کر اب آپ بچنے کے لیے بے کار ہی ہاتھ پیر مارتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "پانچ سو میں آج

بنتا ہی کیا ہے؟ کچھ انکم ٹیکس کٹ جاتا ہے، کچھ انشورنس، پراویڈنٹ فنڈ میں چلا جاتا ہے۔ کچھ بیوی کمیٹی کے لیے رکھ لیتی ہے تاکہ اس بیٹی کی شادی کر سکے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔۔۔" لیکن صاحب آپ کچھ بھی کیجیے۔ مہمان اندازہ لگا چکا ہے کہ آپ کے گھر میں اور کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔

ہر معقول آدمی کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے کیونکہ مرد عورت کا رشتہ ہی جھگڑے کا ہے۔ لیکن جب مہمان گھر میں آتا ہے تو وہی جھگڑا مہابھارت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بیوی آپ سے کتنی نفرت کرتی ہے، اس کا اُس وقت تک پتا نہیں چلتا، جب تک مہمان گھر میں نہ آئے۔ جیسے آپ کو بھونکنے کے سوا کچھ نہیں آتا، ویسے ہی بیوی یا در کھنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ جانے کب کا بغض آپ کے خلاف سینے میں لیے بیٹھی ہے جو مہمان کے آتے ہی پنڈورا باکس کی طرح آپ کے سر پر اُلٹ دیتی ہے۔ مہمان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے وہ کہتی ہے "دیکھیے بھائی صاحب۔ دن میں چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں اور اس پہ دُودھ کا ایک گلاس نہیں پیتے۔ آپ بتائیے ان کو خشکی ہوگی کہ نہیں ہوگی؟ نہ ناشتے کا کوئی وقت ہے نہ کھانے کا۔۔۔ اب پینے کی نئی لت پڑ گئی ہے۔ اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان آئے اور ان کے پینے کا بہانہ ہو جائے۔۔۔ آج تو میں اُنھیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔"

"کیسے؟" مہمان شرارت سے کہتا ہے۔

بیوی کچھ مسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہتی ہے "بوتل کو، اور کسے ؟ آپ بھی بالکل نہ پیجیے گا، بھائی صاحب "

مہمان تھوڑا گھبرانے لگتا ہے اور لہجے میں وہ پیار لے آتا ہے جو وہ اپنی سگی بیوی کے لیے کبھی نہیں لایا — "کبھی کبھی پی لینے میں کوئی حرج نہیں، بھابی! مرد لوگ . . . . "

بیوی ایکا ایکی میز پر ہاتھ مار کے کہتی ہے۔ "نہیں "

"ہاں " میں جواباً کہتا ہوں اور بوتل ڈھونڈنے چل نکلتا ہوں جو بیوی نے گودریج کی الماری میں چھپا رکھی ہے اور تالا لگا دیا ہے۔ میں کنجی مانگتا ہوں اور وہ ٹھینگا دکھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں چابی کہاں کھنستی ہے، لیکن مہمان کے سامنے وہاں سے نکال نہیں سکتا۔ چونکہ میرے شوہری وقار کو ٹھیس لگتی ہے اس لیے میں آگ بگولا ہو جاتا ہوں اور بیوی کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہوں۔ "یہ عورتیں! . . . . آپ دو روپے کمائیں اور دیانت دار آدمی کی طرح آتے ہی ایک روپیا ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ باقی کے روپے میں آپ بس کا کرایہ رکھیں اور صرف اٹھنی اپنے موج میلے کے لیے۔ جب بھی ان کی نگاہ آپ کی اٹھنی پر رہے گی۔ مرد سے یہ آخری سانس تک نچوڑ لیں گی اور جب وہ مر جائے تو اونچی اونچی آواز میں روئیں گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ مر گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اب نچوڑیں گی کیسے ؟ "

"بکو مت " بیوی کی بلند آواز آتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ہے۔ ابھی سے اسے فکر پڑ گئی

کہ یہ گیا تو روپیا کہاں سے آئے گا؟ لیکن آپ اپنا ٹیمپو کم نہیں ہونے دینا چاہتے۔ آپ مہمان سے کہتے ہیں ــــ "آپ ہی بتائیے بھائی صاحب... ہر بیوی شادی کے دس سال میں یہ ہو جاتی ہے۔ اس دلھن کو دیکھیے جسے آپ برسوں پہلے گھر لائے تھے اور جس سے والہانہ پیار کیا تھا، دو گھونٹ پینا ضروری ہیں یا نہیں؛ یہ ذلیل سا گھر ہمارا.... جب میں پی لیتا ہوں تو مجھے یہ بیجو ایلیہ معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ گندا سا محلہ ہینگنگ گارڈن!" پھر میں آنکھوں میں شعلے اور انگارے برساتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں "دیکھو شانتی! مجھے آکاش وانی ہو رہی ہے۔"

بیوی آکاش وانی کا مطلب سمجھتی ہے، اس لیے ڈر کے مارے چابی میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے لیکن اس کے بعد جو ہتھیار میرے خلاف استعمال کرتی ہے، اس کے سامنے آکاش وانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ رونے لگتی ہے اور مہمان سے مخاطب ہوتی ہے ــــ "آپ کو کیا بتاؤں بھائی صاحب! جب یہ پی لیتے ہیں تو آدمی نہیں رہتے۔"

"کیا ہو جاتے ہیں؟" وہ پوچھتا ہے۔

بیوی ہچکچاتے ہوئے کہتی ہے "باہر جاتے ہیں۔"

"باہر جانے میں کیا حرج ہے؟" مہمان عارفانہ تجاہل کے ساتھ کہتا ہے "باہر کی کھلی ہوا......"

"اوہو۔ آپ نہیں سمجھتے۔"

"او۔" مہمان کہتا ہے، جیسے وہ سمجھ رہا ہے۔
"آپ ایسے نہیں، تو سمجھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی مرد ایسا نہیں؟" اور پھر گھگھیا کر رونے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ ذلیل اور گھٹیا مہمان ہم میاں بیوی پہ جج بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ بیوی مجھے نقطوں سے بھری ہوئی گالیاں دیتی ہے اور میں اُسے بے نقط سناتا ہوں۔ مہمان بیچ بچاو کرتا ہے۔ باہر سے دُکھی مگر اندر سے سُکھی نظر آتا ہے۔ آخر وہ مجھے بے تحاشہ صلواتیں سنانے لگتا ہے . . . . "شرم آنی چاہیے آپ کو۔ ہم نے ہزاروں عورتیں دیکھی ہیں لیکن شانتی ایسی دیوی نہیں دیکھی۔ آپ اگلے سات جنم تک بھی لگے رہیں تو ایسی ستی ساوتری آپ کو نہ ملے گی۔"
"اگلے سات جنم؟ میں پچھلے سات جنم سے لگا ہوا ہوں۔"
"کیا کہا؟"
"پچھلے سات جنم سے ستی ساوتری کی تلاش میں ہوں، اور اب جا کر مجھے یہ ملی ہے شانتی۔ اب تو مجھے موکش ملنے والا ہے۔"
بیوی عقیدت کے ایک جذبے سے مہمان کی طرف دیکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس گھر میں مہمان کی نوکری پکی۔ یہ تو موٹی عقل کا مہمان بھی جانتا ہے کہ کسی کے گھر میں رہنا ہے تو بیوی کے ساتھ بنا کر رکھو۔ اب وہ مجھے اور بھی بُرا بھلا کہنے لگتا ہے۔ بیوی چونکہ مرد کا EGO ہوتی ہے، اس لیے میاں اوپر سے بے حد خفا ہوتا ہے اور بھیتر سے خوش۔ بیوی کے سلسلے

میں اسے کھانا کھا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنے جوتے کھا کر ہوتی ہے۔ ہر بیوی کسی انتقامی جذبے سے چاہتی ہے کہ مرد کو وہ بے بھاو کی پڑیں کہ نانی یاد آجائے اور پھر وہ بے دست و پا ہو کر اس کی شرن میں چلا آئے۔ جب وہ اسے ایسا پیار دے جو ماں ہی اپنے بچے کو دے سکتی ہے، جب وہ پڑوس کے کلوا سے پٹ پٹا کر گھر آتا ہے۔

لیکن آپ کا مہمان تھوڑی ہی دیر میں آپ کا سب مزا کرکرا کر دیتا ہے۔ وہ آپ کو آنکھ مار کر ایک طرف لے جاتا ہے اور بالکونی پر لے جا کر بڑی راز داری سے کہتا ہے "آپ بھی ایک ہی پنتنک ہیں۔ ہوتی میری بیوی تو ایک جھانپڑ دے کر گھر سے نکال دیتا۔"

مہمان کو گھر سے بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کے کپڑوں پہ سیاہی انڈیلنے، روٹی میں ریت ڈالنے، گھر کا مین سوئچ آف کر دینے کے سب طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ خود ایک دم گھبرا جاؤ، جس سے آپ کا مہمان بھی گھبرا جائے گا۔ اس کی اتنی خاطر کرو کہ وہ توبہ توبہ بول اٹھے۔ اس کا پاؤں ہی زمین پر نہ پڑنے دو۔ اس کے منہ سے 'پ' نام کا حرف نکلے تو دوڑ کر پانی کا گلاس لے آؤ۔ پلنگ پر بیٹھا وہ زمین کی طرف دیکھے تو سلیپروں کی جوڑی اٹھا کر سامنے رکھ دو۔ وہ آپ سے بار بار معافی مانگے گا۔ لیکن اس بات کا آپ پہ ذرا بھی اثر نہ ہو۔ باتھ روم کا بٹن آپ دباؤ۔ نل بھاگ کے کھولو اور ایسے میں دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لو۔ غلطی سے کہیں وہ خود ہاتھ دھونے لگے تو ایک تولیہ لے کر کھڑے رہو۔ ٹی کا لوٹا خود ہاتھ میں لے کر سامنے بیٹھ جاؤ اور اس کے منت کرنے پر بھی نہ ٹلو۔

لیکن یاد رہے۔ یہ سب نسخے باریک عقل کے مہمانوں پر چلتے ہیں، موٹی عقل کے مہمانوں پر نہیں۔ پچھلے مہمان کو میں باریک عقل کا سمجھا تھا لیکن وہ موٹی عقل کا نکل آیا۔ میرے یہ سب کرنے کے بعد اس نے منڈی ہلائی اور کہا — "آپ بڑے دیوتا آدمی ہیں۔"

جب میری سمجھ میں آیا کہ میں کیا ہوں ؛

پھر مہمان کے ساتھ جو اس کی بیوی آتی ہے، وہ عجیب ہی چیز ہوتی ہے نہ جانے آپ کیسے اُسی وقت اندر کے کمرے میں جاتے ہیں، جب وہ کپڑے بدل رہی ہوتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر ایک طرف بھاگتی ہے۔ آپ گھبرا کر دوسری طرف۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی رہی سہی ساری بھی کھُل جاتی ہے اور جب آپ دونوں سخت وحشت کے عالم میں اُلٹی سمتوں میں بھاگتے ہیں تو نہ جانے کیسے پھر برآمدے میں ٹکرا جاتے ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے آپ اپنے ہونٹ پونچھتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔

مہمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ایوالانش بھی آتی ہے جس کا نام بچے ہیں اور جو شکل ہی سے مہمان کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے پیار کرنا چاہیے کیونکہ وہ پرماتما کے راج بھوت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ چھوٹے نلی چوچو کی ناک بہہ رہی ہے، جسے وہ ہمیشہ اپنی قمیص کے کف سے پونچھتا ہے۔ بڑا باہر سے کھیلتا ہوا آتا ہے اور اپنے کیچ سے لت پت پانو دوان پر رکھ دیتا ہے۔ ان کی ماں رسمی طور پر انھیں ڈانٹتی ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں — "بچے ہیں، بھابی۔ یہ تو ایسے ہی کریں گے جیسے بچے کرتے ہیں۔

انھیں روکنا بڑی غلطی ہے ؛ یہی نہیں، آپ اپنے علم کے زور پر اسے بتاتے ہیں کہ بچے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ نہ کریں تو ان میں تخریبی جذبے دَب جاتے ہیں اور اس وقت نکلتے ہیں، جب وہ بڑے ہو جائیں لیکن یہ بات تو آپ بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے بچے، آپ کی سب بات سمجھ رہے ہیں۔ ابھی آپ نے کھانے کے لیے لقمہ منہ میں نہیں رکھا کہ اڑ ڑڑڑ دھڑام کی آواز آتی ہے۔ آپ سب بھاگتے ہوئے بغلی کمرے میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لینن کا بُت جو آپ لینن گراڈ ہی سے لائے تھے، زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور ننھی چوچو پاس کھڑا کچھ فاتحانہ، کچھ مجرمانہ انداز سے ہنس رہا ہے۔ ہے ہے ہے ہے ......
اب ماں دکھاوے کے لیے تھپڑ مارتی ہے لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ وہ کس پھولوں کی چھڑی سے اس کی تواضع کر رہی ہے۔ اب آپ ہیں اور آپ کی بیوی جو اسے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا انتا کرن تو کہتا ہے۔ سالے کو ننگا کر کے ٹکٹکی لگا کر وہ بید مارو کہ چمڑی اُدھڑ جائے لیکن اُوپر سے آپ یہی کہتے ہیں "کیا ہوا بھابی ؟ بچے تو توڑیں گے ہی۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا ؟ ... چھوڑو اب مار ہی ڈالو گی معصوم کو؟" پھر چھڑانے کی بجائے اسے آگے دھکیلتے ہوئے آپ کہتے ہیں۔ "روس والے اب مجھے REACTIONARY سمجھنے لگے ہیں ورنہ میں ایک اور بُت ماسکو سے لے آتا۔"

بجلی مجھ پر اس وقت گرتی ہے جب میرا مہمان اور اس کی بیوی دونوں مل کر بچے سے کہتے ہیں "نمستے کرو، نمستے کرو انکل کو... ارے کنگ"

اب کنگ ماں کی دھوتی پکڑ کر اس کے پیچھے چھپنے لگتا ہے اور مشکوک انداز سے آپ کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی ادا سے کہتا ہے "نمائیں۔۔۔"

بچّے کا باپ اسے پکڑتے، سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے "ارے نمستے کر سالے انکل چاکلیٹ دیں گے۔"

جبھی ماں اتراتی ہے "میرا کنگ چاکلیٹ بہت پسند کرتا ہے۔"

آپ فوراً کہتے ہیں "چاکلیٹ لے دوں گا بیٹے۔ اور ٹافی بھی۔"

حالانکہ اتنا کرن کہتا ہے۔ تھوڑا سا پوٹاشیم سائنائیڈ بھی۔ میں پھر شروع ہوتا ہوں۔

"تمھارے لیے غبارہ لاؤں گا، کنگ! بہت بڑا غبارہ نمستے۔۔"

"ہی ہی ہی۔ نمشتے!" آخر کنگ کہتا ہے۔

پھر اس کا باپ شروع ہوتا ہے۔۔۔۔ "یار کنگ، انکل کو اے بی سی ڈی سناؤ۔"

کنگ انکار میں سر ہلا دیتا ہے۔ اور پھر ماں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے "ارے سناؤ نا، شرما کیوں رہے ہو؟" ماں اسے پھر سامنے لاتے ہوئے کہتی ہے "انکل سائکل لے کر دیں گے۔"

"ہاں میں کہتا ہوں "کار لے دوں گا۔"

جب کنگ فارم میں آتا ہے اور کہتا ہے۔ "چابی والی کار نائیں، انکل! وہ والی۔" اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ وھیل کی شکل بناتا ہے۔

آخر میرے وعدہ کرنے پر وہ شروع ہوتا ہے۔

"اے۔۔۔ بی۔۔۔ سی۔۔۔ ڈی۔۔۔ ای۔۔۔ ہی ہی،

مجھے سُو سُو آیا ہے ممی۔۔
"ارے!" ممی یوں اظہار کرتی ہے، جیسے کوئی ان ہونی بات ہوگئی۔
"چل اندر"
اور وہ وہیں سے اس کا ازار بند کھولتی ہوئی کنگ کو باتھ روم کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن جاتے میں یہ بھی کہہ جاتی ہے "بالکل باپ پر گیا ہے، کام کے وقت سُو سُو۔۔۔۔"
باپ ہنستا ہے۔ میں بھی ہنستا ہوں۔ میری بیوی ہنستی ہے۔ ساری دنیا ہنستی ہے۔
ہمارا مہمان پھر شروع ہوتا ہے۔ "بڑا ذہین ہے اپنا کنگ!"
"کیوں نہ ہو" میں اتفاق کرتا ہوں "ذہین ماں باپ کی اولاد۔"
حالانکہ میرا انتاکرن کہتا ہے۔ گدھے کا بچہ گدھا ہی ہوگا، گھوڑا کیسے ہو جائے گا؟
جبھی ایک طرف سے کوئن چلی آتی ہے۔ انگریزی GEN-DER کے سب قانون جھٹلاتی ہوتی؛ کیونکہ وہ کوئن ہونے پر بھی کنگ کی بہن ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہر دل عزیزی دیکھتی اور جلتی رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی بڑی پاٹھ شالہ میں پڑھتی ہے، سامنے آتے ہی وہ، بنا کسی فرمائش کے، ایک پرُانا، بے سُرا سا گانا شروع کر دیتی ہے۔

"ہیے دیا مئے، ہم سبھوں کو شدھتائی دیجیے۔۔۔۔"
میں بھجن سنتا ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنی تائی یاد آجاتی ہے۔ جو بہت ہی شُدھ ہے۔۔۔۔ میں اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے کوئن تو بیچ

ہی میں ٹوک دیتا ہوں اور کہتا ہوں ــــ "واہ، کیا گلا پایا ہے۔۔۔
بڑی ہوگی تو لتا منگیشکر سے کم کیا ہوگی؟" اور میرے انتا کرن سے
آواز آتی ہے۔ مینڈک کی اولاد!

لیکن کوئن، بدستور گا رہی ہے۔ انترہ پہلے اور استھائی بعد میں،
اس سے بھجن اور بھی موثر ہو جاتا ہے۔

"ایسی کرپا اور انوگرہ ہم پہ ہو پرتما"

چونکہ وہ بچی ہے، اس لیے بھلائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتی
اور بڑی نمرتا سے پرارتھنا کرتی ہے جس سے وہ پرانا اور فرسودہ گانا نیا
اور ماڈرن ہو جاتا ہے۔ ع

"دور کر کے ہر بھلائی کو برائی دیجیے"

اتنے میں کنگ فارغ ہو کر چلا آتا ہے اور کوئن کو گاتے دیکھ کر
شروع ہو جاتا ہے "میں بھی سناؤں گا! اردو کا سبق۔"

ارے سناؤ، سناؤ کنگ۔۔۔ یار کنگ تم تو۔۔۔" ہم سب
کہنے لگتے ہیں۔

اب کنگ ایک ہی سانس میں سبق سنا جاتا ہے۔

"بچھو سے کسی نے پوچھا۔ تو جاڑے میں باہر کیوں نہیں آتا؟
بچھو نے کہا۔ گرمیوں میں میری کونسی خاطر ہوتی ہے جو جاڑے میں
بھی باہر آؤں؟"

اور پھر کنگ یکبارگی الٹا سانس لیتا ہے۔ ہا!

٭ ٭ ٭

آخر ایک دن ہمیں آناً فاناً پتا چلتا ہے کہ ہمارے مہمان جانے والے

ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ہمیں اپنے شرگباشش ہونے کی خبر دے دیتے ہیں بلکہ کچھ یوں کہ اس سہانی صبح کو ہمارا مہمان ہمارے پاس آتا ہے، محبت بھرا ہاتھ ہمارے کاندھے پہ رکھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ خود سرکتا ہمیں سرکاتا ہوا، بالکونی کی طرف لے جاتا ہے اور کھسر پھسر کے انداز میں بات شروع کرتا ہے "بات یہ ہے، میں نے بینک میں ایک چیک ڈالا تھا۔ ۔ ۔ ۔"

میں ایکا ایکی سب سمجھ جاتا ہوں اور اُسی وقت پوچھتا ہوں۔ "کتنے روپے چاہییں آپ کو ؟"

وہ کہنے لگتے ہیں۔ "میں دِلّی پہنچتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔"

اب میں اپنے مہمان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ جو آدمی مجھے پیسا لوٹانے کی بات کرتا ہے، میرا اُس کے منہ پہ تمانچا مارنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر وہ تو میرا اتنا کرن ہے۔ میں اُسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں "ارے یار، تم نے آتے ہی کیوں نہ مانگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنے چاہییں ؟"

"زیادہ نہیں" وہ کہتے ہیں۔ "یہی تین اِک سو روپے۔"

مَیں فوراً بھاگا ہوا اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی کے پاؤں پر سر رکھ دیتا ہوں اور اس سے تین سو روپے لاکر مہمان کو دے دیتا ہوں۔ وہ کچھ کھسیائے ہوئے انداز میں مجھے تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اندر سے کتنا خوش ہوں۔ بھلا مہمان اس کے لاؤ لشکر، کنگ کوئین، پرنس رائل اور اس کے پورے شاہی خاندان سے چھٹکارا پانے کی تین سو روپے بھی کوئی قیمت ہے ؟

فلم بنانا کھیل نہیں

فلم یوں تو کھیل ہے، لیکن اس کا بنانا کھیل نہیں۔ ارادے اور روپ ریکھا سے لے کر فلم بنانے تک بیچ میں بیسیوں، سیکڑوں ایسی رکاوٹیں آتی ہیں کہ بڑے دل گردے والا آدمی بھی دم توڑ سکتا ہے۔

سوشل فلم باقی دوسری فلموں سے الگ نہیں، لیکن زیادہ مشکل اس لیے ہے کہ اس کے ساتھ آپ پر زیادہ ذمے داری آپڑتی ہے۔ ہمارا سماج مختلف قسم کا ہے۔ کئی مذہب، نسل، صوبے، بولیاں ٹھولیاں ہیں۔ جمہوری نظام نے انفرادی طور سے سب کو بنیادی حقوق دے رکھے ہیں، اور مجموعی طور پر برابری کے حقوق۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان حقوق کے خلاف ہوں، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور سے ابھی میرے بھائیوں کو ان حقوق کا استعمال

کرنا نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے، جب میں نے فلم "مرزا غالب" لکھی تو اوّل اور آخر ہمارے سامنے مقصد یہ تھا کہ دیش کے کونے کونے میں مرزا غالب کا کلام گونجے۔ لوگ ان کے خیالات اور ان کی شاعری کی عظمت سے روشناس ہوں۔ کہانی تو ایک بہانہ ہوتی ہے، جس کی مدد سے آپ اس عہد کے سماج کی پرچھائیاں قلم بند کرتے ہیں۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں ـــــ "آواز اٹھی اور نہ آنسو بہے۔ شہنشاہ ہند کی حکومت جمنا کے کنارے تک رہ گئی۔" مغل عہد ختم ہو رہا تھا اور برٹش سامراجیت دھیرے دھیرے اپنے پنجے پھیلا رہی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مرزا صاحب جب جیل سے رہا ہو کر اپنی محبوبہ کے یہاں آتے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ اس وقت وہ ایک سادہ مگر دُکھ بھرے جملے میں اس عہد کا پورا نقشا کھینچ دیتے ہیں "ارے کہاں ہو دِلّی والو؟ . . . . دن دہاڑے ہی سو گئے؟" اس پر بھی کچھ لوگوں کو سوجھی کہ مرزا صاحب کی عشقیہ زندگی کیوں پیش کی گئی؟ جیسے وہ انسان نہیں تھے، ان کے دل نہیں تھا۔ وہ کتنے دل والے تھے، ان کے خطوط پڑھ کر پتا چلتا ہے۔

تاریخی فلموں کا ذکر محض تذکرہ ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ کسی نہ کسی طرح سماجک پہلو لیے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کا اشارہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مہاراج رنجیت سنگھ کے بارے میں فلم بنانا آسان

نہیں ہے۔ حقیقت سے متعلق دو مورخوں کی رائے آپس میں نہیں ملے گی۔ پھر وہ مقصد ان کی زندگی کے انفرادی پہلو کو فلم کے پردے پر نہیں لانے دے گا۔ آپ کو کئی اداروں سے کلیرنس حاصل کرنا ہوگا اور جب وہ حاصل ہوگا تو اسکرپٹ کی شکل بالکل بدل چکی ہو گی، جس میں آپ اپنا چہرہ پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ کچھ اس قسم کی باتیں ہو جائیں گی — آپ بہت اچھے ہیں، میں بھی بہت اچھا ہوں۔ تندرستی ہزار نعمت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر آپ ان کے شکوک کے خلاف جائیں گے تو مورچے لگیں گے، آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور آپ گھر کے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ آپ زیب النساء کے بارے میں فلم نہ ہی بنائیں تو اچھا ہے، کیونکہ وہ اورنگ زیب کی بیٹی تھی اور اس لیے سیزر کی بیوی کی طرح تمام شکوک اور شبہوں سے اوپر۔ عاقل خاں گورنر ملتان سے ان کی محبت کو نہ صرف مشکوک سمجھا جائے گا، بلکہ اس کی صحت، میرا مطلب ہے، قصے کی صحت کو بیہودہ قرار دیا جائے گا۔
آپ دور کیوں جاتے ہیں، حال ہی میں ستیہ جیت رائے نے، جنھیں دنیا ایک بڑے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مانتی ہے، ایک فلم بنائی جس میں ایک نرس دکھائی گئی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر رات کو دھندا کرتی ہے۔ اب وہ ایک انفرادی بات تھی جس کا اجتماعی طور پر نرس پیشہ عورتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پر اس پر بھی ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نرسوں نے آندولن چلایا اور ستیہ جیت رائے کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب بات

بات نہیں کہ ایک طرف لوگ 'مرزا غالب' اور 'سنسکار' جیسی فلموں کے خلاف مظاہرے کرتے ہیں اور دوسری طرف بھارت سرکار انھیں سال کی بہترین فلم قرار دیتی ہے۔ اس کے بنانے والے کو راشٹرپتی اپنے ہاتھوں سے سورن پدک اور مان پتر پیش کرتے ہیں۔

ساماجک فلم اپنے یہاں بنانے میں اپنے یہاں دیش کے حالات بہت آڑے آتے ہیں۔ مختلف گروہ، قومیں اور مقصد تو ایک طرف، خود سرکار بھی اس گناہ سے بَری نہیں۔ مثال کے طور پر سرکار کی پالیسی اہنسا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے گا کہ کئی ہنسا استعمال کرنے والوں کو ہم نے اپنا رہنما مانا ہے، اُن کے سامنے سر جھکایا ہے اور اس کے سہرے گائے ہیں۔ میں شہید بھگت سنگھ کی مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ شہید بھگت سنگھ اول اور آخر کرانتی کاری تھے، وہ من سے سوشلسٹ تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ طاقت کے استعمال کے بنا برٹش سامراجیہ کا تختہ الٹنا ممکن نہیں ہے۔ اب آپ ان کے بارے میں فلم بنائیں تو ایک طرف ان کو ان کے ساتھی بھگوتی چرن ورما کی بیوی کو بار بار بھابی کہہ کر پوشیدہ سیکس کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف ان کے اسمبلی میں بم پھینکنے کے واقعے کو یا تو چھوڑ دینا ہوگا اور یا پھر اس کا بیان یوں کرنا ہوگا کہ وہ صرف سامراجیہ کو چونکانا چاہتے تھے۔ تبھی ایک اندرونی تضاد پیدا ہو جائے گا۔ کیا لاہور میں سپرنٹنڈنٹ پولس سانڈرس کی ہتیا بھی

انھوں نے انگریزوں کو چونکانے کے لیے کی تھی؛ اگر آپ اِن واقعات کو ایسے ہی دکھائیں گے جیسے کہ وہ واقع ہوئے تو آپ حملوں کا نشانہ بنیں گے، کیونکہ ملک میں کئی ایسے گروہ ہیں جو گولی بندوق پر یقین رکھتے ہیں اور سرکار کی پالیسی ایسی ہے کہ وہ دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ ان کروڑوں نوجوانوں کا کیا ہوگا جو دن رات یونی ورسٹی کیمپس میں اودھم مچاتے رہتے ہیں۔

یہ تاریخ کو چڑانے والی بات ہوگی کہ ہم کہیں کہ ہندستان کو آزادی صرف اہنسا کی پالیسی کی وجہ سے ملی۔ اس میں رائل نیوی کے ناوکوں کا بھی ہاتھ تھا جنھوں نے گھٹیا قسم کے کھانے اور بدسلوکی کا بہانہ لے کر ہندستان کی آزادی کے لیے لڑائی لڑی، مخالفت کی اور بمبئی کی گلیوں میں انگریز کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ جلیان والا باغ کے بیسیوں سال کے بعد اودھم سنگھ نے لندن پہنچ کر مائیکل اوڈائر کو گولی ماردی اور ہماری قومی بے عزتی کا بدلہ لیا۔ لیکن آپ اس سوشل اور تاریخی سچ کو مصیبت میں آئے بغیر نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے کہ برطانیہ کے ساتھ ہمارے کامن ویلتھ تعلقات ہیں، جو موجودہ بین الاقوامی حالات کو دیکھتے ہوئے ہم کسی طرح نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حقیقت کی آنکھوں میں نہیں گھور سکتے۔

سوشل فلم بناتے وقت ہم ہر ہر قدم پر ایسے بیسیوں خطروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ آپ قومی ایکتا پر فلم بنا رہے ہوں

تو آپ میں ہمت نہیں ہو گی کہ رانچی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے واقعات کو ان کی صحیح صورت میں پیش کر سکیں، کیونکہ ان میں ایک مذہب یا قوم کے لوگوں نے دوسرے پر وحشیانہ ظلم ڈھائے تھے۔ آپ ہندو مسلم فساد دکھاتے ہیں تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ جہاں دو ہندو مرے ہوں وہاں دو مسلمان مارکے دکھائیں۔ اس پر بھی نہ ہندوؤں کی تسلی ہو گی نہ مسلمانوں کی۔ دونوں آپ سے ناخوش، دونوں ناراض اور اس پر آپ کو سینسر سرٹیفکٹ لینے میں تکلیف ہو گی۔ تو یہ آپ طلبہ کے موجودہ ایجی ٹیشن کو بھی نہیں ٹٹول سکتے۔ ان کے دنگوں اور مخالفت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ یونی ورسٹی کیمپس میں آج جو ہو رہا ہے، آخر ہے کیا؟ کیا صرف یہ بات ہے کہ آج کل نوجوانوں کا دماغ پھر گیا ہے؟ وہ اپنا اصل مقصد چھوڑ کر سنیاسی ہوتے جا رہے ہیں یا وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہیں؟ آخر اس مار دھاڑ کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی تو گاندھی جی کو مانتے ہیں۔ پھر کیوں یہ لوگ ایکا ایکی اُمڑ کر مار کاٹ کرنے لگتے ہیں؟ ان باتوں کی تہ میں جانا اور ان کے بارے میں فلم بنانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ ایسا کریں گے تو کئی ہزاروں کے پانو پر آپ کے پانو پڑیں گے اور وہ سب ہیں بڑی پہنچ والے۔ اس لیے آپ صرف گول گول دال والی بات کیجیے۔ پانچ چھے گانے ڈال دیجیے۔ دو چار ناچ۔ ماں باپ، بیٹے بیٹوں کو بچپن ہی سے بچھڑوا دیجیے تاکہ بڑا بھائی جوان ہو کر پولیس انسپکٹر ہو جائے۔ انجانے ہی میں اپنے چھوٹے بھائی کو ملزم کے طور پر عدالت میں پیش کرے اور یہ بعد میں پتا

چلے کہ جج ان دونوں کا باپ تھا اور ماں جو بیٹے کے خلاف گواہی دے رہی ہے، اس کی بیوی تھی۔ پھر تو باپ کے لیے مشکل ہو جائے، ماں کے لیے مصیبت۔ نوجوانوں کے بارے میں فلم بنائیے تو صرف یہیں تک پہنچیے کہ بڑوں کا عشق عشق تھا اور چھوٹوں کی محبّت بدنامی اور بدکاری۔ اُسے 'اُچت' مت لکھیے کہ شری مدبھاگوت سے لے کر ان تک استری اور پُرشوں کے بیچ کیا کیا گر دائیں ہوئیں۔ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ چند مصیبتوں میں پڑے۔ بڑوں کے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ وہ انھیں سیاسی اور رہنما نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو اپنے ہی اُلٹے معنی پہناتے ہیں۔

اب آپ اس بدنام لفظ 'سیکس' پر آجائیے۔ ہمارا سماج یہ تو سہن کر سکتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ناچتے ہوئے ایک پیڑ کے گرد یا موٹر میں بیسیوں چھچھوری اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کریں، لیکن باغ میں جو پیار کرنے والے کا اپنی محبوبہ کو پہلا اُپہار ہے، وہ اُسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی فلموں میں دو، تین، چار ریلیں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لیتے ہیں کہ راجو کو رادھا سے محبّت تھی۔ لیکن نفسیاتی بات جو چند سیکنڈ میں ثابت ہو سکتی ہے، پورا معاشرہ اس کے خلاف ہے، ہمارا سماج اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ کھجوراہو، کونارک کے وارث یہ بات کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں ــــ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس عمل کو ڈھکے چھپے ڈھنگ سے پیش کیا جائے اور فلم جو کسی حد تک آرٹ بھی ہے، کمرشیل اور بیشہ وروں کے ہاتھوں سے نکلتی جائے۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چند مناظر کو فلمانے کی اجازت اچھے اور بڑے فلم سازوں کو یکساں نہیں ہے۔ یوں سنسر نے اپنے لیے گنجائش رکھی ہے کہ ہر فلم

اور اس میں ہونے والے واقعات کو بنانے والے کی نیت اور واقعہ کی نوعیت میں دیکھا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے مان بھی لیا جائے کہ سنسر کے چودھری بڑے دل والے ہیں، مگر ان کا کیا کیجیے گا جو پبلک کی سطح پر تصویر کو پاس کرنے کے سلسلے میں پہلے دیکھتے ہیں اور جن کا ادبی ذوق قابلِ غور ہے اور جو بار بار اس بات کا دعوا کرتے ہیں — "میں فلم نہیں لکھتا، نہ دیکھتا ہوں"۔

مثال کے طور پر میں ایک فلم بناتا ہوں جس کا بنیادی خیال ہے کہ بانغ ہوتے ہوئے بچّے کو جنسی تعلیم دینی چاہیے اور اُسے اُن تمام خطروں سے آگاہ کرنا چاہیے جو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب صاف ہے کہ اگر میں لڑکے اور لڑکی کے سلسلے میں کوئی لغزش نہیں دکھاؤں گا تو ڈراما پیدا نہیں ہوگا اور دکھاؤں گا تو اس کا حل مجھے وہی پیش کرنا پڑے گا جو مقبول ہے اور وہ نہیں جو نفسیاتی ہے۔

حال ہی کی بات ہے، میں ایک فلم بنا رہا تھا، جو نفسیاتی تھی۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر کسی اور لڑکی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اُس کے جانے کے بعد اس عورت کے ایک بچّی پیدا ہوتی ہے۔ جوان ہو کر وہ شادی کرتی ہے، پر ماں بیٹی کے ساتھ یوں چپک جاتی ہے کہ داماد کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی اور داماد کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ لیتی ہے اور ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو اپنی بیٹی کی جگہ پر دجیکٹ کر دیتی ہے۔

انسان اپنے دماغ میں کئی بار ایسی ایسی باتیں سوچ لیتا ہے جو

سماجک اور اخلاقی نظریے سے قبول نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے۔ چاہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت بڑا پاپی اور گناہگار سمجھے۔ اس لیے ایسا ہی ہوتا ہے، سانس ایک لمحے کے لیے رک تو جاتی ہے، پر فوراً ہی چونک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے اور احساسِ گناہ سے اُوت پردت مندر میں جاکر بھجن گانے لگتی ہے ــــ 'مورے تو گردھر گوپال دوجا نہیں کوئے'۔

اس سین کو فلمایا تھا کہ میری ہیروئن نے اس پر اعتراض کیا، "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا "ہوتا ہے میڈم۔ اور پھر جب میں یہ دکھلاتا ہوں کہ وہ ایک گنہگار ہونے کے جذبے سے شرمندہ ہوکر سیٹ سے چلی جاتی ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟" میڈم نے وہ سین کر تو دیا، پر سوچتی رہی کہ اس پر پبلک سے جوتے پڑیں گے۔ میں نے اس پر بھی کہا کہ جوتے جو پڑیں گے، آپ مجھے بھیج دیجیے، میرے اپنے جوتے پرانے ہو گئے، بلکہ پھٹ چکے ہیں۔

سوشیل فلم بنانے والے کی حیثیت اس عورت کی طرح ہے جو غرارہ پہنے ہوئے کسی پارٹی میں گئی اور جب لوٹی تو برسات ہو چکی تھی اور گھر کے سامنے پانی ہی پانی تھا۔ اس کے مرد نے سروالٹر ریلے کی طرح راستے میں اینٹیں اور سلیں رکھ دیں اور وہ غرارے کو سنبھالتی ہوئی چلی۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ ایک اینٹ ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دھپ سے پانی میں گری ــــ غرارے سمیت! سادھنا اُسے لے ڈوبی۔

نا بابا۔ سماجک فلم بنانے میں بڑی جوکھم ہے۔ چاروں طرف سے آپ ننگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بدن پر کھال بھی نہیں اور نمک کی کان سے

گزرنا پڑ رہا ہے۔

فلمیں سماجک اور دوسری کن حالات میں بنتی ہیں، اِس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ نام کی ہمیں پوری آزادی ہے۔ مگر اس کے بعد جو مراحل پیش آتے ہیں اس عالم میں مجاز کا شعر یاد آجاتا ہے:

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بِن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

گیتا

میں خفا ہوں، بے حد خفا! ___ انسان سے، دیوی سے، خدا سے اور اس نجاہل سے جسے انسانیت کا ایک بہت بڑا حصّہ خدا کے نام سے یاد کرتا ہے۔
خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ .... آپ ایک مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے اپنے سے، انسان سے بڑا درجہ دیتے ہیں اور مقامی طور پر اسے اپنے لیے آخری حقیقت سمجھتے ہیں لیکن ایک دن وہ مورتی اپنے ٹھکانے پر سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے میں آپ کس سے شکایت کریں گے؟ کسے کوسنے دیں گے؟ کیا آپ ساکن چیزوں میں حرکت کی پیچیدہ حسابی مساوات اور اس کی اقلیدسی شکلوں میں اُلجھیں گے یا اس سائنسی حقیقت پر سر دُھنیں گے کہ پتھر نہ صرف زندگی رکھتا ہے بلکہ بہت دور کا ایک نامحسوس اور اسقول سا ارادہ بھی؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ پتھر نے کسی اندرونی تحریک سے خود کو گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہو؟
دانائے راز ان باتوں کا کیا جواب دے سکتا ہے، سوائے اس بات

سے کہ وہ چُپ رہے اور دنیا کی سب بے ذقت اور مہمل موتوں کے دُکھ کو کہیں دور، دل کے اندر، اپنے آفاقی غم کا حصہ بنا لے۔ پھر ٹکسلے کے ٹھٹھولیے پائلٹ کی طرح سے آگے گزر جائے اور اس منزل پر پہنچ کر انتظار کرے جہاں ذقت کی حدیں بس ہو جاتی ہیں اور انسانی خفگی عقلِ کل سے سوال کرتی اور اس کا جواب باقی ہے۔

گیتا کو اس وقت موت نے آلیا۔ جب وہ زندگی کے اوج پر تھی۔ چیچک سے بچنے کے لیے اسے کئی بار ٹیکہ لگوانے کے لیے کہا گیا لیکن اس نے ہمیشہ انکار کر دیا کیونکہ اس کے والد کو انسان کی اس چارہ جوئی کے باوجود چیچک ہو گئی تھی جس میں اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے جاتی رہیں۔ گیتا۔ جو ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی، ماں، اور دوست تھی، سب کا کہا مانتی تھی لیکن اس نے کیوں ضد پکڑ لی؟ یہ کیسا انکار تھا۔ جو اس کے منہ سے نکلا تھا؟ کون سا ہاتھ تھا جو اسے موت کی طرف کھینچ رہا تھا؟ ہو سکتا ہے گیتا سے یہ بھول نہ ہوتی تو وہ آج اپنے بچوں مکی اور کاجل اپنے میاں شمی، اپنے بہن بھائیوں اور ان گنت عزیزوں اور دوستوں کے درمیان ہوتی۔ لیکن کہیں اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا یا آنکھیں چلی جاتیں تو کیا ہوتا؟ گیتا جو زندگی میں اپنی ہی شرط پر جینے کی عادی تھی، کیسے مشروط زندگی سے مصالحت کر لیتی؟ اسے دیکھ کر اس کے لاکھوں چاہنے والوں کا کیا حال ہوتا؟ اپنے چاہنے والوں کو نہ دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی؟ اس قسم کے سوال پھر LA--MYSTIQUE کی حدیں چھونے لگتے ہیں اور آخر مبتلائے عقل آدمی اس حقیقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ جو ایک ہی جست لے کر زندگی کی باقی سب 'حقیقتوں' سے آگے آکھڑی ہوتی ہے اور

وہ ہے موت - یہ سچ ہے کہ گیتا آج نہیں ہے. اس پار آکر اس کے بڑے سے پتے پر لڑھکنے والے شبنم کے قطرے کو چتا کی آگ نے دھواں بنا دیا ہے. وہ بمبئی میں بان گنگا کے شمشان میں جلائی جا چکی ہے اور اس کی روح ایک ایسی شانتی پا چکی ہے جس کی تمنا گیتا نے ہرگز نہ کی تھی کیوں کہ اس نے تو اضطراب کا راز پا لیا تھا-

بان گنگا کے شمشان کے ساتھ ہی وہ مندر تھا جہاں دس برس پہلے گیتا نے اپنا ہاتھ شمی کے ہاتھ میں دیا تھا اور پیار نبھانے کی سوگند لی تھی - اس نے تو اپنی سوگند نبھا دی لیکن شمی کی سوگند کا کیا ہوا؟ وہ شمی سے محبت کرتی تھی، ایسی محبت جو ہمارے شاستروں اور ہماری مریادا نے ایک پتنی کو تفویض کی ہے - وہ بیک وقت پتنی، دوست اور ماں تھی اور ایک فاصلے سے اپنے پتی کے کھلنڈرے پن کو دیکھا کرتی تھی. شمی کے پیار میں بھی وہی والہانہ پن تھا جسے میں نے گیتا کی باتوں کے بین السطور جانا ہے - چنانچہ جتنے دن گیتا بیمار رہی، شمی اپنا سب کام چھوڑ کر گیتا کی نگہداشت کرتے رہے. اس کی جانکاہی میں محبت کے کئی چھوٹے اور بڑے وعدے کیے اور نیازیں گزاریں جو ایک طرح کے واسطے تھے قضا و قدر کو، جو قسمت نے تسلیم نہ کیے - جب ان کی شادی ہوئی تھی تو مندر کے بت، ساحل کے سنگریزے، سمندر کی لہریں اور اُس وقت کا آسمان جانتے تھے لیکن ان سب نے مل کر اس حسین جوڑے کو چند برس کے لیے عشرت کی چھوٹ دے دی تھی -

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

میں نے اس مضطرب روح کو اس کے بچپن ہی سے دیکھا ہے۔ گیتا لاہور میں ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ جب بھی وہ نظر کی پہیلی کی طرح۔ یہ تھی وہ گیتا "قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے دبلے پتلے بدن اور گورے چٹے چہرے میں ایک ہی چیز باقی کے، تمام خدوخال سے نمایاں تھی اور وہ تھیں اس کی بڑی بڑی آنکھیں۔ جن میں حیرت تھی، جستجو تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو۔ وہ ہر بات کی ماہیت جاننا چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔ اس کی آنکھیں پپوٹوں میں ایک تیز گراری کی طرح سے چلتی تھیں اور یہ تھا بھی ٹھیک کیونکہ انھیں سو سال کا سفر چونتیس برس ہی میں طے کرنا تھا۔ گیتا کی آنکھیں درسی کتاب پر اتنا نہ رکیں جتنا کتابِ زندگی پر۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون کے آر پار نکل سکتی تھی۔ ورنہ عام کتاب میں تو الفاظ اور پھر کاغذ نظر کی پرواز کو جکڑ لیتے ہیں اس کی حیرت انگیز سمجھ بوجھ ایک عام تعلیم یافتہ آدمی سے کہیں زیادہ تھی کیوں کہ اس کے علم کا مدار وجدان پر تھا لیکن اس کی نگاہوں میں کہیں ایک لمحہ ساکت تھا جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا۔ نظروں کی قوس میں ایک مقام خالی تھا جہاں تک کوئی نہ پہنچا۔

چند لوگوں نے فروعی طور پر ان آنکھوں کے سحر کو جانا اور غالباً اسی لیے انھیں صرف شوخی اور چلبلے پن اور کہیں ایک آدھ جذباتی سین میں استعمال کر سکے۔ پہلی فلم جس میں گیتا نے منفرد اداکاری کی، سہاگ رات تھی جس کی شوٹنگ ہی کے دوران میں ہدایت کار نے اس نظر کے اٹھنے اور جھکنے کے بیچ میں نغمہ و سحر بھی دیکھ لیا اور آہِ صبح گاہی بھی اور اپنی اگلی

تصویر کا نام بانو زرے نین رکھ دیا لیکن گیتا کے نام لینے کے باوجود وہ ان
ان شاہین بچوں کے پر پرواز کی قوت اور ان کی اڑان کا اندازہ نہ
کر پائے ۔ ان کا اندازہ گیتا کو تھا لیکن غیر شعوری طور پر۔ آخر کوئی وجہ
تھی کہ جب گیتا نے اپنی تصویر 'رانو' بنانے کا فیصلہ کیا تو اپنے ادارے
کا علامتی نشان دو آنکھیں رکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جو ایک طرف تو
بدری ناتھ کے مندر پر بنی ہوئی بھگوان دشوناتھ کی آنکھیں تھیں جو منزلوں
دور سے آنے والے جاتریوں کو دیکھتی اور ان کی رکھشا کرتی ہیں اور
دوسری طرف دیوی کی آنکھیں جو انسانی زندگی کو اس کے پاپ اور پُن میں
دیکھتی ہیں۔ من اور اس کی درتیوں کے آر پار چلی جاتی ہیں اور ہر جذبے
کے ساتھ رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ ابھی ان میں دَیا ہے ابھی کرونا اور ابھی چنڈی
کا کوپ۔ ابھی جزا ہے' ابھی سزا اور پھر چھپا۔ آنکھیں نہ صرف دل کا آئینہ ہیں'
بلکہ باہر کی دنیا کو بھی دیکھتی ہیں اور اس کا عکس دل میں اتار لیتی ہیں۔ ان کا
اوّل اور آخر مقصد ہے دیکھنا اور اپنا آپ دکھانا لیکن ہر گاہ خاموش
رہنا۔ ایسی خاموشی کہ نطق بھی جس کے سامنے پانی بھرے اور یہ گیتا کی خاص
بات تھی۔ وہ بات کرنے والے کی طرف ٹک ٹک یوں دیکھتی تھی کہ وہ بعض
اوقات گھبرا اٹھتا تھا۔ لیکن اسے گیتا اور اپنے رشتے کے بارے میں فوراً
پتا چل جاتا۔ ابھی وہ آپ کی دوست ہیں' ابھی دشمن' پھر دوست نہ دشمن'
ایک ہی لمحے پہلے ہستی سے معمور وہ آنکھیں اچٹ کر ہستی کی منزلوں میں
گم ہو گئی ہیں ...

مجھے اس سے دلچسپی نہیں کہ گیتا نے فلمی دنیا میں کامیابی کا
سنگلاخ راستہ کیسے طے کیا یا وہ کون کون سی تصویروں میں آئی۔ مجھے

کتاب سے دل چسپی ہے، اس کے ابواب کی فہرست سے نہیں۔ اگر کسی فلم میں اسے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تو اس لیے کہ کہانی یا منظر اس کی وجدانی سمجھ میں آ گیا یا کوئی ذہین ہدایت کار جزوی طریقے سے پھر اسے گیتا کے ذہن تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اکثر اور بیشتر ہمارے ہدایت کار اپنی مجبوریوں کے باعث گیتا سے وہ کام نہ لے سکے جس کی صلاحیت گیتا میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی اچھی کہانی، کسی اچھے خیال اور جذبے کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی۔ کبھی ماحول کی مناسبت اور کردار کے اچھے ہونے سے اسے کام کرنے میں مزا آتا اور کبھی صرف خانہ پُری کر دیتی اور اپنے تنہائی کے لمحوں میں بیٹھ کر رو دیتی۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ فلم اور فلمی اداکاری کے بارے میں گیتا کی نظر انتقاد اتنی بلند تھی۔ کہتے ہیں عنقا کا آشیانہ بلند ہوتا ہے لیکن گیتا کا ٹھکانہ عنقا کے آشیانے سے بھی کہیں اوپر تھا۔ یعنی وہاں جہاں کبیر کے ایک بھجن کے مطابق بغیر بادلوں کے بجلی چمکتی ہے اور بن سورج اُجیارا ہوتا ہے۔ جہاں آنکھوں کے بغیر موتی پروئے جاتے ہیں اور بنا شبد کے شبد کا اُچارن ہوتا ہے مجھے یاد ہے ایک بار باتوں باتوں میں میں نے کچھ ایسے فلم بنانے والوں کے نام لے دیے جنھیں نہ صرف ہمارا ملک بلکہ باہر ملکوں کے لوگ بھی مانتے ہیں۔ مڑ کر دیکھا تو گیتا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اس سے پہلے کہ میں اس کی وجہ پوچھتا، گیتا میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی اور پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے التجا کر رہی تھی کہ میں آیندہ اس کے سامنے کبھی ان لوگوں کے نام نہ لوں۔ وفورِ جذبات میں وہ چند ایسے نام بھی لے گئی جو اس کے اپنے قریب کے تھے وہ فلم 'رانو' کو کسی ایسے ہی دیکھے نہ سنے انداز میں بناتا

چاہتی تھی - اس نے اپنے لیے وہ مقام متعین کر رکھا تھا جس تک آج تک کوئی نہ پہنچا - شاید مرے بغیر وہ خود بھی نہ پہنچ سکتی تھی - جب مجھے پتا چلا کہ گیتا کس دیس کی باسی ہے...

میں نہیں جانتا اسے میں اپنی اس وقت کی خوش قسمتی کہوں یا اس وقت کی بدقسمتی کہ خود میرے اور اپنے عزیز دوستوں کے منع کرنے کے باوجود گیتا نے میرے ناول "ایک چادر میلی سی" کو فلمانے کا فیصلہ کر لیا - گیتا کے پاس یہ ناول میرے دوست وید صاحب لے گئے تھے جنھیں آخر اس فلم کا ہدایت کار ہونا تھا - ہماری گیتا کو منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ "ایک چادر میلی سی" کی کہانی ہماری مروجہ فلمی کہانیوں سے یکسر الگ تھی - چھوٹتے ہی اس کی نائیکہ رانو چار بچوں کی ماں دکھائی دیتی تھی - پھر اپنی بدکرداریوں کے کارن اس کا پتی قتل ہو جاتا تھا اور رانو کو اپنے دیور پر چادر ڈالنا، اس کے ساتھ شادی کرنا پڑتی تھی جو عمر میں اس سے گیارہ سال چھوٹا تھا اور جسے اس نے ایک بچے کی طرح پالا تھا - گیتا کو رانو کے کردار میں ایک بہت بڑی رینج دکھائی دی اور وہ اس پر مرمٹی - رانو اور گیتا میں کیا مماثلت تھی ؟ غالباً یہی کہ دونوں نے دکھ دیکھا تھا - اپنی فلسفیانہ تحلیل میں رانو دیوی تھی کیونکہ اس نے زندگی کو ایک بھرپور طریقے سے جیا - اس نے مار کھائی، مار، اپنے بیٹے، اپنی بیٹی، اپنی محبت کے لیے اس نے میٹھے مالئے، شراب کی بوتل توڑی اور پھر اپنے دیور کو رام کرنے کے لیے اسے پلائی بھی - لیکن ان سب باتوں کے باوجود دیور نے اس کے سارے پاپ چھما کر دیے - یہی نہیں وہ خود دیوی ہو گئی... دیا اور کرونا کے پرساد بانٹنے لگی... رانو کے کردار نے گیتا کے دل میں ایک عجیب سی گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ زندگی کے بھلے برے کے آخر

میں موکش ہے چنانچہ میرے ناول کی نائیکہ اور یہ نائیکہ دونوں آخر موکش کو پہنچ گئیں اور میں بیچ ہی میں رہ گیا۔

اس بات سے گیتا کے بہت سے قریبی لوگ بھی واقف نہیں کہ گیتا کو FATHER FIXATION تھا: اس کی سب حرکتیں ایک 'اناتھ' لڑکی کی طرح تھیں۔ وہ کھلتی تھی تو بے تحاشا کھلتی اور جب سمٹتی تو ایک پھول کی طرح اپنی پنکھڑیاں کچھ اس انداز سے بند کرلیتی کہ سب کیڑے مکوڑے اس میں گھٹ کر مرجاتے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ورسوا میں اس کے پتا کا انتقال ہوا۔ میں مردے سے بہت ڈرتا ہوں لیکن نہ معلوم یہ کیسا رشتہ تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے گیتا کے باپ کو نہلایا۔ جب سے گیتا نے میری طرف اس انداز سے دیکھنا شروع کر دیا جیسے کوئی بیٹی باپ کی طرف دیکھتی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے اپنی تصویر 'رانو' کا باپ کہا کرتی تھی۔

گیتا کے دل میں تخلیق اور اس کے خالق کے لیے بے پناہ جذبہ تھا، اور عقیدت تھی۔ چاہے وہ زندگی اور فن کا کوئی شعبہ ہو۔ وہ پائے کے مصوروں، موسیقاروں، شاعروں اور مصنّفوں کے سامنے یوں ہتھیار ڈال دیتی جیسے اس کی اپنی کوئی شرط ہوتی ہو۔ وہ انھیں اپنے دل میں وہی درجہ دینے لگتی جو ایک عام آدمی کسی اوتار یا ولی اللہ کو دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کوئی اس کے ایثار، اس کے بلند معیار پر پورا نہ اترتا تو اسے برابر ہی کی مایوسی ہوتی اور پھر ایکا ایکی اسے جھٹک بھی دیتی۔ وہ شائیت کی گرویدہ تھی اور اس سلسلے میں اسے کئی بار اپنے اردگرد کے ماحول سے ٹکر لینا پڑتی۔ لیکن چونکہ گیتا کا ہر پل تنودرن تھا اس لیے وہ مچھلی کی طرح ہمیشہ دھارے کے خلاف، زندگی کے آبشار کے اوپر ہی اوپر پہنچنے کی

کوشش کرتی۔ بیچ میں ایسے لمحے بھی آئے جب وہ عملی زندگی کے ساتھ مصالحت کے سلسلے میں ہار بھی جاتی۔ جب وہ خاموش ہو جاتی اور صرف کسی نگاہ والے ہی کو اس کی اندرونی کیفیت کا پتا چلتا۔ اس کی شکل سمندر کی سی ہوتی جو اوپر، سطح پر سے تو شانت نظر آتا ہے لیکن اندر، اپنے سینے میں بڑوانل لیے ہے، جب اس کا راز اگلوانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا... البتہ پتا اس وقت چلتا جب کچھ کشتیاں ڈوبی ہوئی ملتیں، کچھ بادبان اور مستول ٹوٹی پھوٹی حالت میں کنارے پر آگئے۔

اس سے پہلے مجھے ایک فلمی رسالے میں گیتا کے بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیتا نے مجھ سے کہا— آپ لیکھک ہیں۔ آپ جو جی چاہے، میرے بارے میں لکھیے اور اس سلسلے میں کسی کی پروا نہ کیجیے —میں نے کہا— یہ نہیں ہوسکتا گیتا! پھر میں نے اپنے مبہم طریقے سے اس سے پوچھا: کیا میں اس بڑوانل کے بارے میں لکھ سکتا ہوں؟ جس کا بھید تم نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں کیا۔ لیکن تمھارا چہرہ، تمھاری آنکھیں اس کی غمازی کرتے ہیں؟ ... کیا میں وہ سب لکھ دوں؟

گیتا کے ساتھ دید بھی بیٹھے تھے۔ گیتا نے ایکا ایکی مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا اور بول اٹھی — "نہیں"۔

اس کے بعد گیتا 'رانو' کی شوٹنگ کے لیے اپنا پورا یونٹ لے کر بنگلہ، پنجاب چلی گئی۔ جہاں اس نے عام دیہاتی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، انھیں کی طرح کے کپڑے پہنے۔ ویسے ہی جاگتی، ویسے ہی سوتی۔ اور ان سے زندہ رہنے کا وہ فن سیکھا جس کے بعد زندہ رہنے کی حسرت نہیں رہ جاتی۔ ایک تالاب کے کنارے رانو کا گھر تھا، جس میں گیتا رہتی تھی، گاؤں

کے سب لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس گھر کے دروازے آج بھی یوں کھلے ہیں جیسے چونک جانے کے بعد کسی کا مُنہ کھُل جاتا ہے۔

گیتا دو برس رانو کے ساتھ سوئی اور اسی کے ساتھ جاگی۔ وہ اُسے اس کے مصنّف سے کہیں زیادہ جاننے لگی تھی۔ وہ خود رانو ہوگئی تھی۔ وہ مجھے خط بھی لکھتی تو اس پر رانو ہی کے دستخط ہوتے۔ پھر وہ بمبئی لوٹ آئی اور ۱۲ر جنوری کی صبح کو گیارہ بج کر دس منٹ پر چل پڑی۔ یہ سب کتنا تیز تیز ہوا... پونے گیارہ بجے تک تو میں عیادت کے سلسلے میں اس کے ہاں تھا۔ گیتا کے سسر پرتھوی راج کپور، اس کے پتی شمی، ڈاکٹر سب نے یقین دلایا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے، ان کے چہروں پر رونق چلی آئی تھی اور رتجگوں کے نقوش مٹنے لگے تھے۔ باہر آکر میں نے بیوی کی تسلّی کے لیے اسے فون کر دیا۔

گھر لوٹا تو میری بیوی رو رہی تھی۔ ایک اور فون آگیا تھا۔

میں گھر سے اپنی وہ کتاب جو پنجابی میں چھپی ہوئی تھی اور جس پر گیتا کی تصویر تھی اسے ساتھ لیتا گیا۔ میں چاہتا تھا گیتا کے ساتھ اسے بھی شعلوں کی نذر کردوں کیونکہ گیتا نے اسے مجھ سے زیادہ جانا تھا۔ پھر میں نے سوچا — شاید یہ جذباتیت ہوگی۔ فلم کے لوگ اسے کوئی دکھاوا سمجھیں گے۔

چتا کے شعلے بلند ہوئے، میری ہمّت پست ہوگئی۔

میں چپکے سے ساحل کی طرف سٹک گیا اور کتاب سمندر میں پھینک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لہروں کے ساتھ واپس آنے لگی۔ گیتا مجھے میری کتاب لوٹانے لگی۔ میں نے کہا — نہیں گیتا! یہ تمھاری ہے۔ اسے

تم ہی فلماؤ گی۔ دوسرا کوئی نہیں۔

— ہو سکتا ہے آج سے پینتیس چالیس برس بعد کسی بڑی بڑی آنکھوں والی اداکارہ کی نظر اس کتاب پر پڑے اور وہ اپنا آپ اس میں دیکھ لے۔ اسے فلمانے کا تہیہ کر لے۔ صرف اسے یہ پتا نہ ہو گا کہ پچھلے جنم میں وہ گیتا تھی۔

راجندر سنگھ بیدی کی دیگر تصانیف

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (افسانے)

اردو کے ممتاز ادیب راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقی تحریروں میں ایک طرف وہ جمالیاتی کیفیت ہے جو فن کو حسین اور دلکش بناتی ہے اور دوسری طرف وہ معنویت بھی ہے جو اس کو عظمت و افادیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ 21/=

سات کھیل (ڈرامے)

راجندر سنگھ بیدی کے سات ڈراموں، خواجہ سرا، چانکیہ، تلچھٹ، نقل مکانی، آج، رخشندہ اور ایک عورت کی نہ، پر مشتمل مجموعہ۔ 17/50

گرہن

"گرہن" بیدی کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلاشبہ یہ افسانے اردو کے کلاسیکی ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں، بیدی اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس کی آنکھ روشن اور دل گرم ہے۔ 15/=

کوکھ جلی (اضافے کے ساتھ)

"کوکھ جلی" بیدی کے مقبول ترین افسانوں کا مجموعہ ہے، اس خاص اڈیشن میں "ماسوا" اور "بیکار خدا" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بہترین کتابت وطباعت۔ 13/50

دانہ و دام (افسانے)

افسانوی ادب کا یہ مجموعہ زندگی کی ان بھول بھلیوں کی سیر کراتا ہے جو تلخ ہوتے ہوئے بھی خوشگوار ہیں۔ 12/=

ایک چادر میلی سی (نیا اڈیشن)

بیدی کے اس ناولٹ میں بھی اُن کے فن کا حسن کہانی سے زیادہ کرداروں کی حقیقت پسندانہ تعمیر سے پیدا ہوا ہے۔ پنجاب کے گاؤں کی بظاہر سیدھی سادی لیکن جذبات میں ہل چل مچادینے والی کہانی۔ انتقام، نفرت، رقابت اور دوسری طرف محبت، ممتا، ایثار اور ہمدردی کی باہمی کشمکش۔ 15/=

اپنے دکھ مجھے دے دو (افسانے)

زبان کی سادگی، ماحول کی خوب تر منظرکشی اور کرداروں کو ان کے فطری رنگ میں پیش کرنا بیدی کے حسن کا طرۂ امتیاز ہے اور افسانوں کا یہ مجموعہ اس کا بہترین ثبوت۔ (نیا اڈیشن) 12/50

انتخابِ ناسخ



مرتب: رشید حسن خاں

صفحات: 320

قیمت: -/84 روپے

انتخاب سراج اورنگ آبادی



مرتب: محمد حسن

صفحات: 100

قیمت: -/45 روپے

پردیسی کے خطوط



مصنف: مجنوں گورکھپوری

صفحات: 216

قیمت: -/65 روپے

عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء

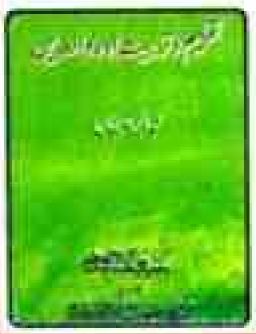


مصنف: محمود الحسن

صفحات: 224

قیمت: -/80 روپے

تعلیم و تربیت اور والدین



مرتب: محمد اکرام خاں

صفحات: 176

قیمت: -/68 روپے

تذکرۂ ماہ و سال



مصنف: مالک رام

صفحات: 432

قیمت: -/130 روپے

کہانی کے پانچ

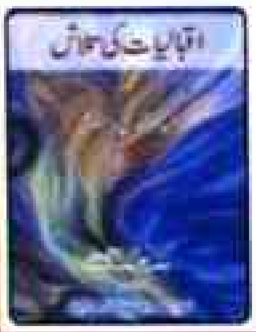


مصنف: شمیم حنفی

صفحات: 140

قیمت: -/60 روپے

اقبالیات کی تلاش



مصنف: عبدالقوی دسنوی

صفحات: 208

قیمت: -/76 روپے

₹ 65/-

ISBN: 978-81-7587-672-9